اسلام کی حکیمانہ زندگی

از ارشادات

سرکار شریعتمدار حجۃ الاسلام سید العلماء
مولانا السید علی نقی صاحب قبلہ مجتہد العصر دام ظلہ

مطبوعہ الواعظ صفدر پریس لکھنؤ
۱۳۵۴ھ

شیعوں کا واحد علمی، ادبی، تاریخی، تمدنی اور مذہبی ماہانہ رسالہ

لامذہبیت کے جراثیم سے بچانے والا

"حقائق" لکھنؤ

مذہب کے آغوش میں لانے والا

اگر آپ ضرورت زمانہ کے مطابق اور اپنی قوم کے شایانِ شان صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے بلند کسی رسالہ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو رسالہ حقائق کی خریداری قبول فرمایئے جس میں ملک کے مایۂ ناز اہل قلم حضرات کے گراں قدر مضامین کے ساتھ ساتھ حضرت سید العلما دام ظلہ (سرپرست امامیہ مشن) کے قلم معجز رقم سے تفسیر کلام پاک کا گراں بہا سلسلہ بھی شایع ہو رہا ہے جو رفتہ رفتہ ہر خریدار حقائق کے پاس کتابی صورت میں جمع ہو جاوے گا۔

اگر آج آپ نے توسیع اشاعت کے ذریعہ اس دینی رسالہ کی بنیادوں کو مضبوط کر دیا تو کل یہ آپ کے اور آپ کے مذہب کے لیے ایک مستحکم قلعہ کا کام دے گا۔

چندہ سالانہ للعہ ششماہی دو روپیہ آٹھ آنہ عہ

قیمت فی رسالہ چھ آنہ (۶؎)

نوٹ: جو مومنین چار روپیہ یکمشت ادا نہیں کر سکتے وہ دو یا چار اقساط میں مرحمت فرما سکتے ہیں۔

المعلن علی الحیدر

منیجر رسالہ حقائق لکھنؤ

فہرست

اہل مذہب کا عظیم الشان فرض — جہاد فی سبیل اللہ کا بہترین موقع

دین حق کی امداد خدا کی امداد ہے

زمانہ غیبت میں جہاد بالسیف کے مواقع بہت کم حاصل ہوتے ہیں مگر جہاد بالقلم و زبان ہر زمانہ میں فرض ہے۔ دوسرے مذاہب کو دیکھئے کہ وہ اپنے عقائد کی نشر و اشاعت میں کس قدر جد و جہد میں مصروف ہیں اسلام کے اوپر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں علاوہ ان دشمنوں کے جو کھلم کھلا اسلام کے اوپر حملہ آور ہیں خود اسلامی جماعت کے افراد کے اندر شکوک و شبہات کا ایک سیلاب ہے جو امنڈا چلا آتا ہے، غیر ممالک میں اسلامی تعلیمات و پیشوایان مذہب کی نسبت ایسی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں جو حقیقت سے کوسوں دور ہیں ضرورت ہے کہ مختلف زبانوں میں مذہب حقیقی اسلام کے عقائد و تعلیمات بیش از بیش درجہ پر شائع کئے جائیں اور نصرت مذہب کا فرض انجام دیا جائے۔

امامیہ مشن لکھنؤ کی حقیقی اہمیت

اسکی سہ سالہ کارگذاری سے بالکل روشن ہو چکی ہے اس نے اتنے عرصہ میں جتنا بھی مواد دنیا کیلئے مہیا کر دیا ہے وہ اس سے بہت زیادہ مدت میں بھی مجتمع ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ مگر آپکو معلوم ہے کہ یہ مشن چند بے سر و سامان غربا نے قائم کیا تھا نہ اسکے پاس کوئی سرمایہ تھا۔ ایک غریب سکریٹری (سید ابن حسین صاحب۔ سابق سکریٹری امامیہ مشن) کے ہاتھ پاؤں و دماغ اور انہی چند غربا کی پر خلوص سعی۔ یہ اس مشن کی تمام سہ سالہ کائنات تھی جس پر اس مشن نے وہ کچھ کیا جو افراد قوم کو معلوم ہے اب تک اسکے رسالے

ساٹھ ہزار کی تعداد میں ملک اور بیرون ملک میں پہونچ چکے ۱۳۶ مستقل رسالے شائع ہوئے متعدد رسالوں
کے متعدد ایڈیشن چھپے، تمام دنیا میں اسکا علم ہو نچا اور اسکے کام کا اعتراف کیا گیا۔

اب وقت آگیا ہے
کہ اسکا دائرہ عمل وسیع کیا جائے۔ پنجاب کے پرجوش حامی ملت سردار کریم بخش
صاحب حیدری کی یہ سکیم مکمل طور سے طے کر دی گئی ہے کہ امامیہ مشن کیلئے پانچ لاکھ
ٹکٹ چار چار آنہ کی قیمت کے طبع کرائے جائیں اور انھیں فروخت کرکے سب سے پہلے ایک مستحکم
پریس قائم کیا جائے اور پھر بقیہ حصہ سرمایہ محفوظ کے طور پر مشن کے استقلال کی غرض سے جمع
کیا جائے جسکے منافع سے مشن کے معمولی ضروریات پورے ہوں چنانچہ

ٹکٹ چھپ گئے
انھیں نہایت دیدہ زیب اور جاذب نظر بنانے کی کوشش کیگئی ہے وسط
میں صدر امامیہ مشن عالیجناب حاجی سید جلال الدین حیدر صاحب قبلہ
سابق ہیڈ ماسٹر الیسین کالج لاہور و بانی انجمن وظیفہ سادات و مومنین کی تصویر ہے
اور اطراف میں لائف ممبران کے اسماء گرامی اور دیگر ضروری امور ہیں۔

ضرورت ہے
اس بات کی کہ افراد قوم زیادہ سے زیادہ تعداد میں مشن کے ان ٹکٹوں کو
خرید فرمائیں اور دوسرے حضرات کو خرید کرنے پر متوجہ فرمائیں۔

طے کرلیا گیا ہے
کہ اس غرض کیلئے وفود کی ترتیب ہوگی اور وہ ہر شہر وضلع بلکہ قصبہ و دیہات
تک میں دورہ کرینگے اور ہر شہر میں محلہ وار ہر گھر کی مردم شماری کرکے ٹکٹ فروخت کرینگے۔

بہت جلد
عملی کام شروع ہو جائیگا آپکو ملت حقہ کی خدمت انجام دینا ہے، اور انصار اسلام
میں اپنا نام لکھوانا ہے تو اس عظیم کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیے۔

تمام خط وکتابت سکریٹری کے نام ہونا چاہیئے۔ ناچیز خادم ملت سید محمد رضا نقوی سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ

اسلام کی حکیمانہ زندگی

از ارشادات

سرکار شریعتمدار حجۃ الاسلام سید العلماء

مولانا السید علی نقی صاحب قبلہ مجتہد العصر دام ظلہ

مطبوعہ الواعظ صفدر پریس لکھنؤ

۱۳۵۴ھ

امامیہ مشن کی ۳۱ ا کتیسویں دینی خدمت

یہ رسالہ جو پیش کیا جا رہا ہے۔ اُن مواعظ کا مجموعہ ہے جن کا پندرہ محرم ۱۳۵۴ھ سے چھبیس محرم تک بارہ روز مسلسل مدرسۃ الواعظین میں سلسلہ جاری رہا تھا اور ہمارے محترم نائب صدر جناب سیّد محمد رضا صاحب نقوی نصیر آبادی نے انھیں شارٹ ہینڈ کے ذریعہ سے قلمبند فرما لیا تھا۔ اب وہ کتابی صورت میں شایع کئے جا رہے ہیں۔

ان مواعظ میں جن اہم مسائل پر تبصرہ کیا گیا ہے وہ یقیناً تمام اہل مذاہب کے فائدہ کا باعث ہیں اور اس لئے اُمید ہے کہ اس کتاب کا تمام حلقوں میں پورے شوق کے ساتھ مطالعہ کیا جائیگا۔

والسّلام

خادم ملت

سید ابن حسین عفی عنہ

سکریٹری امامیہ مشن۔ حسین آباد لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سید المرسلین محمد المصطفیٰ و آلہ الطاہرین۔

تمہید

وہ موضوع جس کے متعلق مجھے ان دس دنوں میں بیان کرنا ہے اشتہاروں کے سرنامہ میں آپ حضرات کے پیش نظر ہو چکا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میرا موضوع بیان "اسلام کی حکیمانہ زندگی اور اس کی بے مثال عظمت" ہے جس طرح ایک موضوع کی تنگدامنی۔ ایک ایسے مقرر کو جو موضوع کے احترام کرنے کی عادت رکھتا ہو۔ اور اپنے کلام کو موضوع کا پابند قرار دیتا ہو۔ بے دست و پا بنا دیتی ہے۔ اسی طرح موضوع کی وسعت۔ ایسے مقرر کو۔ جو موضوع کے متعلق تمام ضروری باتوں کو بیان کرنے کی کوشش کرنا چاہیے گنگ بنا دینے کیلئے کافی ہے۔ وقت تنگ ہو۔ اور موضوع کی وسعت بیان زیادہ چاہتی ہو۔ اسوقت نہ پوچھئے کہ کس قدر دشواری محسوس ہوتی ہے۔

دس دن ہیں لیکن موضوع اسقدر وسیع ہے کہ دس عشرے بیان کئے جائیں تب بھی وہ تشنگی کی شکایت کرے۔

اسلام کی حکیمانہ زندگی اور اسکی بمثال عظمت

دوسرے جز کو چھوڑ دیجئے اُس کی توضیحی حیثیت ہے صرف پہلا جزو "اسلام کی حکیمانہ زندگی" یعنی اسلام نے انسان کی زندگی کے لئے کیا اصول کیا آئین اور کیا قاعدے مقرر کئے ہیں اور اُن میں کتنے حکیمانہ پہلو ہیں۔ اسے ہی دس دن میں بیان کرسکوں۔ دشوار ہے۔

بہرحال عرض کروں گا۔ اور جو کچھ ہوسکے گا عرض کروں گا۔ مختصر طور پر سہی۔

زندگی کا حقیقی مفہوم

"اسلام کی حکیمانہ زندگی" اسکے لئے سب سے پہلے تو ہمیں ضرورت پڑتی ہے عام طور پر زندگی کے معنی سمجھنے کی کہ زندگی کے معنی کیا ہیں؟

جب زندگی کے معنی سمجھ لیں تو یہ سمجھنے کی ضرورت ہوگی کہ انسان کی زندگی کیا ہے؟ جب انسان کی زندگی کا معیار بھی ہم نظر عقل سے مقرر کرلیں تو پھر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام نے انسان کی زندگی کے لئے کیا اصول اور آئین مقرر کئے ہیں اور اسلام کے مقررہ اصول در نظام زندگی کا

ہم کو موازنہ کرنا ہوگا۔ دنیا کے تمام نظام ہائے زندگی سے۔ جو مختلف اقوام و ملل نے جماعتی و انفرادی زندگی کے لئے مقرر کئے ہیں۔ اس کے بعد ہم کو حق ہوگا یہ کہنے کا کہ اسلام نے جو نظام زندگی پیش کیا ہے وہ بہترین نظام زندگی ہے۔ اسلئے کہ جب وقت تک ضد کے مقابل ہیں ضد نہ آئے۔ اسکے لئے کسی فضیلت کسی عظمت کا دعویٰ درحقیقت ویسا ہی ہے۔ جیسے تنہا پیش قاضی روی راضی آئی "

یعنی یک طرفہ کسی شے پر نظر ڈالئے۔ اُسکے معنی یہ ہیں کہ آپنے اس تصویر کا ایک ہی پہلو دیکھا لیکن دوسرے پہلو کو جس میں آپ کو کمزوری کا اندیشہ تھا چھوڑ دیا۔ اب اگر اسلام کے کسی نظام زندگی کی عظمت کو ثابت کرنا چاہیں تو آپ کیلئے ضروری ہے کہ آپ دنیا کے دوسرے قوانین پر نظر ڈالیں۔ تب آپ کو حق ہے یہ کہنے کا کہ اسلام کے اصول میں جو عظمت پائی جاتی ہے وہ کسی مذہب میں نہیں۔

زندگی کا مفہوم ظاہری حیثیت سے تو بہت کھلا ہوا ہے۔ لیکن حقیقتاً بہت مبہم ہے۔ "زندگی" صرف کسی شے کے کسی بکسی حیثیت کے موجود ہونیکا نام نہیں ہے۔ موجود ہونے کے علاوہ زندگی کا کچھ اور مفہوم ہے۔ ایک وہ ہے جسکے لئے آپ کہتے ہیں جاندار رہنا۔ یہ زندگی وہ ہے جو درحقیقت ہر حیوان میں پائی جاتی ہے۔ اور اسکا معیار یہ ہے

کہ جبتک روح نے جسم سے جدائی نہیں اختیار کی زندگی ہے۔ یہ زندگی ایسی ہے جسکے لئے کسی لائحہ عمل کی ضرورت نہیں ہے۔ روح کا جسم کے ساتھ تعلق رہنا اور نہ رہنا۔ ایک واقعی کیفیت ہے۔ جبتک روح ہے زندگی ہے، روح جدا ہوگئی مردہ ہوگیا۔

یہ مفہوم زندگی کا ایسا نہیں ہے کہ اسکو کسی حکیمانہ قانون کے تحت میں لایا جائے لیکن جس زندگی کے متعلق ہمیں کلام کرنا ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ وہ زندگی ہر چیز کے لئے اُسکے اعتبار سے ہے اور مختلف حیثیت رکھتی ہے۔

زندگی کا اُس اعتبار سے کہ جو میں کہتا ہوں اتنا وسیع مفہوم ہے کہ جو دنیا کی تمام جاندار اور غیر جاندار چیزوں میں پایا جاتا ہے۔ آپ صنف جمادات پر غور کیجئے۔ تو ہر چیز میں ایک دور زندگی ملے گا۔ اور ایک دور موت ملے گا۔

جمادات کو دیکھئے زمین بے حس و حرکت چیز ہے۔ نہ نشو و نما کی صلاحیت ہے نہ انسانی خواہشیں ہیں۔ کچھ نہیں مگر ارباب عقل اور اہل شعور نے زمین میں بھی ایک حالت موت قرار دی اور ایک حالت زندگی۔ چاہے یہ نہ دیکھئے کہ زمین جاندار کب ہوتی ہے لیکن زمین زندہ ضرور ہوتی ہے۔ وہ زمین جو مدت تک خشک پڑی ہوئی ہو

جس میں دانہ بویا نہیں گیا جس میں زراعت نہیں ہوی۔ وہ زمین مُردہ زمین ہے۔ پھر یہ زمین زندہ کیونکر ہوتی ہے؟

زندگی اس زمین کی اس طرح ہے کہ اسمیں صلاحیت پیدا کی جائے دانہ کے روئیدہ ہونے کی۔ اُس زمین کی اصلاح کیجائے اُس کو سیر و سیراب کیا جائے یہانتک کہ اسمیں نشو ونما بخشنے کی طاقت ہو اور اُس میں نباتات روئیدہ ہوسکیں۔ آپنے تخم پاشی کی اور زراعت کی تو اب وہ زمین زندہ ہے۔ قرآن مجید نے بھی اسی محاورہ میں اطلاق کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحییٰ بہ الارض بعد موتھا۔ "ترجمہ" خدا نے آسمان سے پانی برسایا تو زندہ کیا اس سے زمین کو جبکہ وہ حالت موت میں تھی۔"

یعنی آب باراں کے چھینٹوں سے، اور اُس قدرتی آب پاشی کے ذریعہ سے یہ صلاحیت پیدا کی کہ دانہ کو روئیدہ کرسکے۔ اس طرح وہ زمین جو مردہ تھی زندہ ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ زمین غیر جاندار چیز تھی لیکن ایک وقت میں وہ مردہ کہی جاتی ہے دوسرے وقت میں اُسے زندہ کہتے ہیں۔ درخت ہی اور وہ زمین سے روئیدہ ہوا ہے اُسکی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ابھی وہ تر وتازہ ہے اسمیں برگ وبار لانے کی صلاحیت ہے

اسمیں قابلیت ہے اسبات کی کہ بہار کے زمانہ میں وہ سرسبز و شاداب ہو

یہ اور بات ہے کہ موسم خزاں کے تغیرات کی وجہ سے وہ وقتی طور پر بر بار

نہ ہو لیکن توقع ہے کہ جب خزاں کا دور گذر جائیگا۔ بہار کا زمانہ آئے گا

تو پھر یہ درخت سرسبز و شاداب ہو جائیگا، آپ اس درخت کو کہیں گا

کہ زندہ ہے لیکن درخت اپنی زندگی پوری کر چکا۔ کہنہ ہو گیا۔ کہنہ ہونے

کی وجہ سے اُسکی صلاحیت جاتی رہی۔ امتداد زمانہ کی وجہ سے پتے

جھڑ گئے اور شادابی نہیں باقی رہی۔ بے برگ و بار ہو گیا اُسمیں ثمر آنے

والے نہیں ہیں۔ اُسمیں سرسبزی پیدا ہونے والی نہیں ہے۔ آپ

کہیے گا درخت مردہ ہو گیا۔ ایسے درخت جلانے کے کام آتے ہیں۔

درخت جاندار تو نہ تھا لیکن اُسکے لئے زندگی ہے اور موت ایک وقت

میں زندہ ہے اور ایک وقت میں مردہ۔

پھول! پہلے غنچوں کی شکل میں تھے اسکے بعد کھلے۔ ابھی

رنگ و بو باقی ہے۔ مرجھائے نہیں ہیں۔ یہ انکی زندگی ہے۔ تھوڑی دیر

میں ہوا کے جھونکوں اور تمازت آفتاب سے پھول مرجھا گیا۔ یہ مردہ ہو گیا

یہ مردہ کیا ہوا کہ مردہ ہو گیا۔ وہ تھا ان کا دور زندگی۔ اور یہ ہے انکا

دور موت۔ حیوانات اور انسانوں میں بھی ایسا ہی ہے۔ آپ

کہتے ہیں یہ زندہ ہے اور یہ مردہ۔ تو یہ کون سی زندگی اور موت ہی

جو غیر جاندار میں بھی ہے ۔ اور جاندار میں بھی ۔

اب زندگی اور موت کا مفہوم ذرا مبہم ہو جاتا ہے ۔ اسلئے کہ وہ چیزیں جو جاندار ہوتی ہیں یعنی حیوانات ، ان میں آسان تھا جبتک روح جسم میں موجود ہے ، اُن کو ہم زندہ کہتے اور جب روح جسم سے نکل گئی تو کہتے مردہ ہیں ۔

لیکن اُن چیزوں میں جن میں کہ بظاہری پردہ موت وحیات کا نہیں ہے جن میں نہ تو روح کبھی تھی اور نہ آئندہ آئے گی ۔ ان میں زندگی اور موت کا مفہوم کیا ہے اس سے ہم اندازہ لگا سکیں گے کہ درحقیقت موت اور زندگی کے معنی کیا ہیں ۔ وہ معنی ہمہ گیر ہیں جنمیں نباتات بھی داخل ہیں جمادات بھی داخل ہیں ۔

اس موت وحیات کا کیا معیار ہے ؟ یہ کیا ہے کہ زمین پانی سے سینچی جانے سے پہلے اور اسمیں آب یاری اور زراعت ہونے کے پہلے زندگی نہ تھی ۔ اور اسکے بعد پیدا ہو گئی ؟ زمین تو پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے ۔ وہی شکل وصورت اب بھی ہے ۔ جو کچھ ہے وہی پہلے بھی تھا ۔ زمین نہیں بدلی ، لیکن ہم اس زمین کو پہلے مردہ کہتے تھے اور اب زندہ کہنے لگے درخت جسوقت سرسبز وشاداب تھا تب بھی وہ درخت تھا ۔ اور اب بھی وہ درخت ہی ہے جبکہ وہ خشک ہو گیا ہے

اور شجر کی ٹہنیاں سب بے ثمر مردہ ہو گئی ہیں لیکن آخر یہ کیا ہے کہ کبھی ہم اسکو زندہ کہتے ہیں اور کبھی مردہ کہتے ہیں۔ یہ موت و زندگی کا مفہوم کیا ہے۔ یہ زندگی کون سی زندگی ہے جو بے جان ہونے کے باوجود ہوتی ہے۔ اور یہ موت کونسی موت ہے جو پہلے سے بے جان ہونے کی حالت میں ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس موت و زندگی کا معیار روح کا تعلق اور عدم تعلق نہیں ہے یعنی اس موت کے معنی روح کا جدا ہونا نہیں ہے۔ نہیں تو بیجان چیز میں تو روح تھی ہی نہیں۔ اسمیں زندگی اور موت کا مفہوم کہاں سے آیا جب بے جان چیز زندہ اور مردہ بن سکتی ہے۔ باوجودیکہ اپنی بے جان حالت پر قائم رہے تو یاد رکھئے کہ جاندار چیز بھی زندگی اور موت سے متصف ہو سکتی ہے باوجودیکہ اپنی جاندار حالت پر باقی رہے۔ یہ زندگی کیا ہے اور یہ موت کیا ہے؟ اگر ہم نے اس زندگی اور موت کے معنی سمجھ لئے تو پھر ہمارے لئے آسان ہو جائیگا اس مشکل کا حل کہ انسان کی زندگی کیا ہے اور در حقیقت کونسا آئین زندگی ایسا ہے۔ جو انسان کو حقیقی معنوں میں زندہ کہلائے جانیکا مستحق قرار دے سکے۔ یہ زندگی جو ہر چیز میں پائی جاتی ہے اور یہ موت جس سے کوئی چیز مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسکا معیار جسم و روح کے باہمی تعلق کے علاوہ کوئی چیز ہے۔ اب وہ معیار کیا ہے؟

میں آپ سے عرض کروں کہ قدرت نے ہر چیز میں اُس کے
حدودِ طبعی کے اندر کچھ صلاحیتیں مقرر کی ہیں کہ وہ شے ان صلاحیتوں کے
درجوں کو طے کر کے حدِ کمال تک پہونچ سکے (میرے الفاظ محفوظ
رکھیے .) ہر چیز کے لئے صلاحیتیں مقرر ہیں . اور ہر صلاحیت کے مختلف
منازل و مدارج ہیں جس طرح ایک چومنزلی عمارت ہو - اُسمیں ہر منزل
دوسری منزل سے علیحدہ ہے . ہر منزل دوسری منزل سے مختلف ہے
لیکن ہر منزل سے آگے بڑھنے کیلئے ، دوسری منزل تک پہونچنے
کیلئے بہت سے درمیانی زینے ہوتے ہیں جب اُن کو طے کیجئے تب پہلی منزل
سے دوسری منزل تک قدم پہونچے گا - درحقیقت یہ منزلیں جو مقرر
ہیں - انھیں تمام اشیاء کے حدودِ طبعی سمجھئے - یعنی عمارت کا منارت ایک چومنزلہ
عمارت ہے جس میں ایک منزل ہے جمادات کی ، ایک نباتات کی ، ایک
حیوانات کی ، اور ایک انسان کی . یہ چومنزلہ عمارت ہے ، اور یہ منزلیں
بجائے خود الگ الگ ہیں . لیکن خود ہر منزل میں بھی مدارج ہیں یعنی پستی
و بلندی کے . ہر منزل میں درجے ، قدم آگے بڑھانے ، اور پیچھے ہٹانے کے
پائے جاتے ہیں . بہت سے ایسے درمیانی منازل و مراحل ہیں جن کے
طے کرنے سے آپ جس منزل میں تھے اُسی منزل میں رہیں گے . لیکن پھر بھی درجہ
مختلف ہو جائے گا . دس سیڑھیاں ہیں تو سیڑھیاں طے کر جائیے

ترقی آپنے ضرور کی۔ بلندی ضرور حاصل کی۔ مگر یہ بلندی ابھی پہلی ہی منزل تک محدود ہے۔ دوسری منزل تک نہیں پہونچی۔ بیشک ہاں ایک خط فاصل ہوگا۔ اگر اُس خط فاصل سے قدم آگے بڑھالیا جائے تو دوسری منزل میں پہونچگئے۔ کائنات میں ایسے ہی مدارج ہیں۔

جماد جماد ہے، نبات نبات ہے، حیوان حیوان ہے، تو کیا اسکے لئے ترقی کے دروازے مسدود ہیں؟ نہیں جمادات جمادات کی حد میں رہتے ہوئے بھی ترقی کا راستہ رکھتے ہیں۔ نباتات نباتات کی حد میں قائم رہتے ہوئے بھی ترقی کی منزلیں اپنے لئے رکھتے ہیں حیوان حیوانات کی حد میں رہتے ہوئے بھی منازل ترقی رکھتے ہیں۔ اور انسان انسان رہتے ہوئے بھی مدارج ترقی پر فائز ہو سکتا ہے۔

یہی وہ ہے جو میں نے مختصر طور پر عرض کیا تھا کہ ہر شے کے لئے اُسکے حدود طبعیہ میں منازل ہیں گرہ وہ جب اُن کو طے کرے تو حد کمال تک پہونچ جائے۔

قدرت نے اُس میں صلاحیتیں ودلیعت کی ہیں آگے بڑھنے کی جبتک کسی شے کے پاؤں میں طاقت آگے بڑھنے کی رہے۔ وہ زندہ ہے، جب اُسکے پیروں کی طاقت جواب دیدے یعنی صلاحیتیں اُسکے آگے بڑھنے کی ختم ہوجائیں۔ یہ اُسکی موت ہے۔ دوسری لفظوں میں

یوں عرض کروں کہ درحقیقت جب تک کسی شے میں قدرت کی ودلیعت کردہ صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ صلاحیتیں کار فرما ہیں اور وہ شے ان درجوں کو طے کر رہی ہے وہ زندگی کے دور میں ہے۔ اور جب وہ اپنی صلاحیتیں کھو بیٹھے اسکی رفتار ختم ہوجائے تو وہ شے مرگئی، مردہ ہوگئی، اس کو آپنے مردہ کہا اسوقت جب اُس میں وہ صلاحیت جو ترقی کی ہونا چاہیئے کار فرما نہ تھی آپ اگر اُس میں دانہ بو دیتے تو فنا ہوجاتا۔ اسلئے کہ زمین میں قابلیت نہ تھی اُس جوہر خاص کو ظاہر کرنیکی جو قدرت نے زمین کیلئے قرار دیا ہے۔ زمین کی صفت قدرت نے کیا قرار دی ہے؟ اُس کی صفت یہ ہے کہ وہ گہوارہ بنے نباتات کی پرورش کا۔ اور نباتات اُس میں پرورش پائیں۔ ظاہر ہوں۔ یہ درحقیقت صفت کمال ہے زمین کے لئے جب تک یہ صفت اُس سے دور تھی اور یہ صلاحیت اُس میں فعلاً موجود نہ تھی آپ نے کہا کہ مردہ ہے۔ جب آپنے زمین میں وہ قابلیت پیدا کردی کہ اب اگر دانہ بویا جائے تو وہ اُسکو صحیح طور سے پرورش کرسکے۔ تب آپنے کہا کہ زمین زندہ ہے۔ مگر بعض زمینیں ایسی ہوتی ہیں کہ کبھی اُن میں زندہ ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ اُن کی موت دائمی موت ہوتی ہے جیسے بعض عارضے ہوتے ہیں لاعلاج اُسی طرح اگر زمین میں ایسا مرض پیدا ہوجائے

کہ وہ اپنے میں دانہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہی نہ ہو تو اسکے معنی یہ ہیں کہ زمین، زندہ نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح درخت کو قدرت نے صفت کمال یہ عطا کی ہے کہ اس میں نشو ونما ہو۔ وہ بڑھے اور بار بار ہو۔ جبتک یہ صفت پائی جاتی ہے وہ زندہ ہے۔ جب یہ صفت رخصت ہو گئی۔ تو موت آگئی۔

پھول میں قدرت نے رنگ و بو عطا کیا ہے۔ جبتک رنگ و بو باقی ہے آپنے کہا زندہ ہے جب یہ صفت کمال الگ ہو گئی آپنے کہا مردہ ہے۔ تو اب درحقیقت قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کا مصروف عمل ہونا یہ ہوئی زندگی اور قدرت کی صلاحیتوں کا فنا ہو جانا کسی شے کا میدان عمل میں بے حس اور شل ہو جانا۔ یہ درحقیقت اسکی موت ہے۔

انسان کی زندگی

جب آپنے زندگی اور موت کا یہ معیار سمجھ لیا۔ تو آپ کو یہ دیکھنا ضرور ہوگا کہ انسان کی زندگی کیا ہے اور موت کیا ہے۔ کیونکہ ہم نے موت اور زندگی کے معنی اچھی طرح سے سمجھ لئے۔ جمادات میں آپ نے آسانی سے حکم لگا دیا۔ نباتات میں بھی آسانی سے حکم لگا دیا۔ لیکن انسان میں زندگی اور موت کا حکم لگانا کچھ آسان نہیں ہے

اسلئے کہ ابھی تک آپ انسان ہی کو نہیں سمجھ سکے کہ وہ ہے کیا۔ آپ اگر انسان کو سمجھ لیتے تو آپ کو حکم لگانا کچھ آسان ہوجاتا لیکن جسوقت تک کہ انسان کو ہم سمجھتے ہی نہیں اسوقت تک ہم کیسے سمجھیں کہ زندگی انسان کی کیا ہے۔ اور موت کیا ہے۔ اسلئے کہ زندگی کسی نہ کسی طرح موجود رہنے کا نام نہیں ہے۔ ورنہ درحقیقت اس عالم کائنات میں ہر چیز کسی نہ کسی صورت سے باقی رہتی ہے شکل بدل جاتی ہے ہیئت میں تبدیلی واقع ہوجاتی ہے ایک شعلہ جس کو آپنے خاموش کر دیا۔ وہ آپ کی نظر ظاہری سے گم ہوگیا۔ لیکن آپ کو کیا معلوم کہ اس کے اجزا اب بھی دامن ہوا میں موجود ہیں۔ یہانتک کہ وہ چیزیں کہ جو درحقیقت ہماری نظر ظاہری میں بالکل فنا پذیر ہیں اور اُن کا وجود کسی طرح سے باقی نہیں ہے۔ یہانتک کہ دہن سے نکلی ہوئی آواز اتنا بے ثبات وجود کہ جب تک پہلا جز عالم وجود سے ہٹ نہیں لیتا دوسرا جز صفحہ ہستی پر قدم نہیں رکھتا اس سے زیادہ بے ثبات وجود کسی چیز کا نہیں ہے۔ لیکن آپ کو کیا معلوم کہ وہ بھی دامن میں ہوا کے ٹکراتی ہوئی میدان سفر میں گامزن ہے۔ اور کہاں سے کہاں پہونچتی ہے۔ اُسکے وجود کا ثبوت یہ ہے کہ ایک جگہ کی آواز دوسری جگہ سنائی دیتی ہے اگر اُسکا وجود کسی عالم میں نہ رہتا تو دوسری جگہ تک پہونچتی کیونکر؟

سفر تو اُس چیز کا ہوتا ہے جو وجود رکھتی ہو۔ کوئی خط ہو تب تو مرسل الیہ تک پہونچے۔ اسی طرح سے اگر دہن سے نکلی ہوئی آواز لبوں سے جدا ہو کر فنا ہو جاتی تو ہوا کی سفارت سے سامعہ تک کون پہونچتا کوئی چیز دنیا کی اس نظام عالم میں فنا نہیں ہوتی کسی وقت کسی شکل میں کسی وقت کسی شکل میں۔ اگر زندگی کے معنی کسی چیز کے رہنے کے ہیں تو اسکے معنی یہ ہیں کہ کوئی چیز مردہ ہوتی ہی نہیں لیکن حقیقۃً زندگی کے معنی یہ ہیں کہ جو خصوصیات اُسکے ہیں وہ موجود رہیں۔

نباتات، میں نے عرض کیا اُسوقت بھی موجود تھے جب اُن میں بار آور ہونے کی صلاحیت نہیں رہی لیکن آپنے کیوں مردہ کہدیا اسلئے کہ درخت موجود تو ہے مگر جو درخت کی صفت ہے یعنی نشو و نما وہ باقی نہیں رہی۔

حیوان، جسوقت کہ روح اُسکے جسم سے مفارقت کر گئی تب بھی تو موجود ہے۔ اُسکا جسم بے جان ابھی تو آپ کے سامنے موجود ہے اُسکی روح بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ تو پھر آپ اس حیوان کو کیوں مردہ کہتے ہیں۔ اسلئے کہ وہ حیوان حیوان ہونے کی حیثیت سے باقی نہیں رہا۔ اگر آپ کو انسان کے زندہ ہونے کی تلاش ہے۔ اگر آپ انسان کی حیات چاہتے ہیں تو انسان انسان ہونے حیثیت میں باقی رہے

تب زندہ کہا جائے گا لیکن اگر انسان مثل حیوانات کے ہو کر باقی رہا۔ تو زندہ تو ہے مگر انسان باقی نہیں رہا۔

اسی لئے زیادہ ضرورت اسکی ہے کہ اگر ہم انسان کی زندگی کو سمجھنا چاہتے ہیں تو پہلے ہم انسان کو سمجھیں کہ انسان ہے کیا؟ جبتک انسان کو نہ سمجھیں اُسوقت تک ہم انسانی زندگی کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ ظاہری آثار زندگی جو ہیں وہ تو حیوانات میں بھی ہیں۔

اطبا نے انسان کی زندگی کو جانچنے کے جو طریقے ایجاد کئے ہیں۔ آئینہ کو سامنے رکھکر دیکھا جاتا ہے کہ سانس کا نشان لگتا ہے یا نہیں سینہ پر ہاتھ رکھکر دیکھا جاتا ہے، نبض کی حرکت سے پتہ چلایا جاتا ہے۔

مگر یاد رکھئے کہ یہ سب چیزیں حیوانی زندگی کے تشخیص کرنے کی ہیں یہ تمام ذرائع ایسے ہیں جن سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ انسان بحیثیت حیوان کے زندہ ہے۔

لیکن انسان کی بحیثیت انسان زندگی اُسکے لئے یہ تمام ظاہری ذرائع بیکار ہیں اسکے لئے کوئی اور نبض ہونا چاہئیے۔ اسکے لئے کوئی اور آئینہ ہونا چاہئیے۔ اُس میں یہ دیکھنا چاہئیے کہ درحقیقت انسان بحیثیت انسان زندہ ہے یا نہیں۔ اسکے لئے ضرورت ہے اس بات کی کہ ہم یہ سمجھیں کہ انسان کیا چیز ہے جب ہم انسان کو سمجھ لیں گے کہ کیا چیز ہے۔ اسوقت

یہ مشکل حل ہو جائے گی کہ در حقیقت انسانی زندگی کس چیز کا نام ہے۔
انسانی نقطۂ خیال مختلف ہو گئے ہیں کہ انسانی زندگی کیا چیز ہے جس کا
باعث یہی ہے کہ انسان کی حقیقت کو ہی ہم ابھی نہیں سمجھ سکے اگر انسان
کی حقیقت کو سمجھ لیتے تو مشکل حل ہو جاتی۔

اِنسان کی حقیقت

حقیقت انسان کا سمجھنا ایک دشوار گذار مرحلہ ہے۔ بات یہ ہے کہ
انسان مجموعۂ عالم کائنات ہے۔ دنیا میں جتنے مرتب اجناس خدا نے خلق
کئے ہیں۔ ان تمام اجناس کا مجموعہ ذات انسان کو قرار دیا ہے انسان
کے علاوہ تمام انواع کو دیکھئے۔ ہر ایک میں جو صفت کمال نظر آئے وہ
انسان میں موجود ملے گی اور اس پر اضافہ ہوگا۔

انسان میں جماد کا کمال بھی ہے یعنی وہ جوہر جو جماد میں پایا جاتا ہے وہ
انسان میں بھی ہے بے شک جماد میں اسکے آگے اور کمالات کا فقدان
ہے۔ انسان اس نقص سے بری ہے۔

اسکے بعد نبات میں جو خصوصیات کمال ہیں وہ بھی انسان میں
پائے جاتے ہیں۔ پھر حیوان میں جو خصوصیات ودیعت کئے گئے ہیں وہ سب

انسان میں پائے جاتے ہیں اور انسانی خصوصیات اُن پر اضافہ ہیں جسطرح کسی چیز کی روح نکالی جاتی ہے۔ لب لباب لے لیا جاتا ہے۔ اُسی طرح جیسے جمادات میں ایک پہلو کمال کا تھا۔ دوسرا پہلو نقص کا نقص جمادات کا اُن کے ساتھ چھوڑا۔ صفت کمال تھی کھنچکر نباتات میں آئی۔ اس صفت کمال میں قدرت نے اضافہ کر کے نباتات کے نوع کی تشکیل کی۔ پھر نوع نباتات میں ایک پہلو کمال کا تھا۔ اور ایک نقص کا۔ کمال کا پہلو قدرت نے جو نباتات میں تھا، جدا کر لیا اور معائب کو چھوڑ دیا۔ نباتات کے معائب نباتات کے دامن میں اور کمالات کھنچکر حیوانات میں آئے۔ یہاں کچھ اور اضافہ ہوا خصوصیات میں جس سے جنس حیوانات کی تشکیل ہوئی۔ قدرت نے نقص حیوانی کو حیوان میں رکھا۔ مگر اُسکی صفت کمال کو لے لیا۔ اُن صفات کمال میں ترقی عطا کر کے اور کچھ اور جوہر دل کا اضافہ کر کے نوع انسان کی تشکیل کی۔ اس طرح۔ درحقیقت انسان مجموعہ کمالات نوع امکان ہے۔ اسکا نتیجہ کیا ہے؟ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ انسان میں جسقدر زیادہ اجناس کی شرکت ہوئی۔ اتنا ہی اُسکی حقیقت میں ابہام پیدا ہوتا گیا اور یہ کلیہ ہے۔ جتنے اجزا زیادہ ہونگے اتنی ہی دشواری سمجھنے میں ہو جائے گی۔

جمادات کے کمال کا دائرہ محدود اور دامن مختصر تھا۔ اُن کا سمجھ لینا

آسان۔ قدم آگے بڑھایا۔ نباتات کا درجہ آیا۔ یہاں ذرا باب وسیع ہو گیا اسرار ورموز مخفی تر ہو گئے۔ اس میں بہ نسبت جمادات کے خصوصیت پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ آج یہ مسئلہ علمی دنیا کا ایک مہتم بالشان محل اختلاف قرار پا گیا کہ نباتات میں بھی حس و شعور ہے یا نہیں۔

اسکے بعد حیوان کی نوبت آئی اور جب یہ نقطۂ ارتقاء حیوان سے بلند ہو کر انسان تک پہونچا تو اب جتنے اجزا تھے۔ عالم امکان کے مخلوق میں وہ تمام اجزا نتھر کر انسان میں مجتمع ہوئے۔ اب یہ انسان مجموعہ اجزائے کمالات ہو گیا مگر اسکی حقیقت مخفی سے مخفی تر ہو گئی۔

اصلی رخ تصویر کا نظر سے اوجھل ہوا نگاہ نے غلطی کی۔ رائے قائم کرنے میں دھوکا ہو گیا۔ انسان؟ وہی "جسم" بھی ہے وہی "نامی" بھی ہے وہی "حیوان" بھی ہے۔ "حیوان" کے معنی جانور کے نہیں، جاندار کے ہیں۔ اور انسان تو وہ ہے ہی۔ کوئی انسان کو کبھی بحیثیت جسم دیکھنے لگتا ہے کبھی بحیثیت نامی۔ اور کبھی بحیثیت حیوان یہ بہت کم ہے کہ انسان کو بحیثیت انسان دیکھا جائے۔

وہ لوگ کم سہی جو بحیثیت جسم یا بحیثیت نبات دیکھتے ہیں۔ مگر وہ لوگ بہت کم ہیں جو انسان کو بحیثیت انسان دیکھتے ہیں۔

میں نے عرض کیا تھا کہ جو ذرائع دریافت حیات کے مقرر کیے گئے

ہیں وہ سب انسان کی حیوانی زندگی کی تشخیص کرنے کے ہیں۔ انسانی زندگی کی تشخیص اطباء کے امکان سے خارج ہے۔ علماء یونان و فرنگ کی قدرت سے باہر ہے کہ وہ انسان اور انسانی زندگی کی تشخیص کر سکیں۔ انسان اگر انسانی حدود میں ایک مادی چیز ہوتا۔ تو بے شک مادی ذرائع سے اُس کی حیات اور موت کو آپ دریافت کر لیتے۔ لیکن یاد رکھئے کہ انسان بحیثیت انسان مادی چیز نہیں ہے۔ انسان بحیثیت انسان جسم نہیں رکھتا۔ وہ آپ کی نظر کے سامنے نہیں ہے۔ آپ آئینہ میں صورت دیکھتے ہیں جسم نظر آتا ہے انسان نہیں نظر آتا۔ آپ جو چیز حسّ ظاہری سے دیکھ لیتے ہیں وہ بہت پست تر جوہر کمال ہے انسان کا یعنی "جسمانیت" اس کو آپ حواس ظاہری سے دیکھکر پتہ اس کا لگا سکتے ہیں۔ لیکن ایک ذرا قدم آپ کا آگے بڑھا اور آپکے حواس ظاہری بے کار ہو گئے۔

آپ آئینہ میں جسوقت اپنے تئیں دیکھتے ہیں یا نگاہ سے دوسروں کو دیکھتے ہیں تو آپ کیا انسان بحیثیت نشوونما ہی کب دکھائی دیتا ہے درخت کو آپ دیکھتے ہیں مگر درخت کا نمو آپ کی آنکھ دیکھ لے یہ ناممکن ہے درخت میں بھی آپ کو جسمیت نظر آتی ہے نمو نہیں نظر آتا معلوم ہوا کہ سب سے پہلا قدم سعی جو میدان کمال میں انسان کا پڑا۔ وہ ہی آپکے

حس ظاہری سے بلند ہو گیا۔ آپ کا حس ظاہری صرف جمادات کے حد کمال تک منحصر ہے، اسکے بعد اور ہر قدم آگے بڑھا۔ اور "نامی" کی حد میں انسان پہونچا۔ اور آپ کے حواس بے کار ہو گئے۔ آپ صبح سے شام تک کسی درخت پر نگاہ جمائے ہوئے رہئے لیکن اُسے بحیثیت "نامی" آپ کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ ہمیشہ جسم نظر آئے گا اور بس۔

آپ کا بچہ آپ کے آغوش تربیت میں پرورش پاتا ہے۔ کون کہتا ہے کہ نہیں بڑھتا؟ ہر منٹ میں بڑھتا ہے۔ ہر سکنڈ میں بڑھتا ہے لیکن کوئی بڑھنے کو اُسکے دیکھے؟ ناممکن۔ معلوم ہوا کہ سب سے پہلا قدم کمال جو انسان طے کرتا ہے یعنی اُس کا نشو و نما۔ یہی آپ کے حس ظاہری سے باہر ہے۔ اسکے بعد حیوانات کا درجہ آتا ہے اُس کے حس و حرکت ارادیہ کو دیکھ سکیں چھو سکیں۔ حواس ظاہری احساس کر سکیں، غیر ممکن ہے۔ اب اس کے بعد کہیں انسانیت کا درجہ ہے۔ تو آپ کی نظر جو کچھ اندازہ کر سکتی ہے وہ اسکی سب سے پہلی صفت یعنی "جسمیت" ہے۔ اُس کا احساس آپ کر سکتے ہیں وہ بھی میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بالکل سطحی نظر سے ہے لیکن اگر ذرا باریک نگاہ ڈالیں تو یہ معلوم ہو گا کہ جسمیت کا بھی احساس آپ کی نگاہ نہیں کر سکتی۔ بلکہ صرف ظاہری لون اور شکل ہے جس کا نگاہ کو احساس ہوتا ہے۔

لیکن یہ جزو عام افراد کی فہم سے بالاتر ہے۔ میں ظاہری حیثیت سے اتنا ہی کہتا ہوں کہ جسمیت وہ چیز ہے جس کا ہماری نظر احساس کرتی ہے اسکے آگے جسم نامی کمال ہم کو نظر نہیں آتا۔ حیوانیت کا کمال ہم کو نظر نہیں آتا۔ چہ جائیکہ انسانیت کا کمال۔ اس سے ایک اور نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ اپنے حس ظاہری میں اتنی قوت پیدا کیجیے۔ کہ جو خدا کی مخلوق ہے۔ اُسکے کمالات کا اپنی حس ظاہری سے پتہ چلائیے تب یہ خیال کیجیے کہ شاید خداوند عالم کا حس ظاہر سے مشاہدہ ہو جائے۔ اسکی مخلوق کو آپ دیکھتے ہیں مگر حقیقۃً اُن کو نہیں دیکھتے پھر جسے آپ دیکھتے ہیں جب اُسے آپ نہیں دیکھ سکتے۔ تو اُس کو کیسے دیکھ سکتے ہیں جس کو دیکھا ہی نہیں۔ انسان پردۂ خفا میں ہے اسکو کیونکر سمجھیں کہ وہ کیا ہے۔ سب سے قریب اپنی صورت یعنی اپنے سے زیادہ قریب کوئی نہیں لیکن یہی قرب سبب خفا بن گیا یعنی دوسروں کو دیکھ بھی لیتے ہیں لیکن اپنے تئیں بغیر کسی مادی چیز کی مدد کے دیکھ بھی نہیں سکتے۔

آئینہ لگائیے۔ شیشہ پر جلا کیجیے۔ دو جز قرار دیجیے۔ ایک لطیف اور ایک کثیف۔ تب چہرہ نظر آئے گا۔ جب اپنے دیکھنے میں ذریعہ کے محتاج ہیں۔ اسلئے کہ ہم اپنے سے بہت قریب ہیں۔ تو جو ہم سے رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے اُس کو ہم نظر ظاہری سے کیونکر دیکھ سکتے ہیں

بے شک اس کو آئینہ کی ضرورت ہے۔ اور جس طرح ایک آئینہ میں دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک کثیف اور ایک لطیف۔ اسی طرح واسطہ ہونا چاہیئے جس میں دو پہلو ہوں ایک مادیت کا اور ایک روحانیت کا۔

بہر حال۔ جمادات کو سمجھ لیا۔ نباتات کو سمجھ لیا۔ حیوانات کو سمجھ لیا۔ دنیا کے ذرے ذرے کو چھان ڈالا۔ لیکن اپنے ہی تئیں نہیں سمجھا کہ ہم کیا ہیں انسان کو کسی نے دیکھا جسمانی اعتبار سے کسی نے نشو ونما کے اعتبار سے کسی نے حیوانی اعتبار سے اگر انسان نام ہے صرف اجزائے مادی کے اجتماع کا جو ایک خاص شکل پر مجتمع ہو کر ایک جسم کی تشکیل کرتے ہیں تو یہ انسان حقیقۃً انواع کائنات میں کوئی ممتاز درجہ نہیں رکھتا۔ اسلئے کہ جتنے صفات اس حیثیت سے پائے جاتے ہیں ان حیثیتوں سے انسان تمام موجودات کائنات میں اکثر سے پیچھے ہے عظمت جسمانی کو لیجیے۔ تو انسان پہاڑ کے مقابلہ میں کب آسکتا ہے۔ اگر نشو ونما کو لیجیے تو وہ چیزیں جن میں نشو ونما انسان کے بہ نسبت زیادہ سرعت سے ہوتا ہے وہ انسان سے آگے ہیں۔ پودا درخت کا جتنا جلد حد کمال تک پہونچتا ہے اتنے جلد انسان نہیں پہونچتا۔ ماننا پڑے گا کہ صفت نشو ونما میں درخت زیادہ کمال رکھتا ہے۔ انسان اس سے کم ہے بحیثیت احساسات ظاہری۔ باصرہ ولامسہ وشامہ وغیرہ۔

بہت سے جانور ایسے ملیں گے جن کے یہ احساسات انسان سے زیادہ تیز ہیں۔ تو پھر انسان اشرف المخلوقات کیونکر ہوا؟

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان ترقی یافتہ فرد سلسلۂ کائنات کی کیونکر ہے۔ جبکہ اس کی تمام قوتیں جو حیوانی حیثیت سے پائی جاتی ہیں اکثر حیوانوں سے کم ہیں۔ مجھے یہ فلسفہ کوئی سمجھائے کہ ترقی ہونے سے قوت بڑھ جاتی ہے۔ یا کم ہو جاتی ہے۔ اگر انسان درحقیقت جداگانہ نوعیت نہیں رکھتا۔ تو کوئی تبلائے کہ وہ احساسات جو کسی دوسرے حیوان میں پائے جاتے ہیں وہ یہاں پہونچتے ہی کمزور کیونکر ہو گئے اگر انسان درحقیقت کسی حیوانی جسم کا نام ہے تو سب سے اشرف نہیں ہے بلکہ پست ہے بہت سی چیزوں سے دنیا کی پھر اگر انسان حقیقۃً اشرف ہے تو آپ کو کوئی جوہر ماننا پڑے گا۔ جو جسمیت کے علاوہ ہو جو نشو و نما کے علاوہ۔ جو حس و حرکت کے علاوہ ہو۔ جو انسان میں ہو۔ دوسروں میں نہ ہو۔ اسلئے کہ اشرف ہے۔ اگر انسان درحقیقت عناصر کے اجتماع کا نام ہوتا تو حقیقتاً انسان کی زندگی کیا ہوتی؟ انہی عناصر کے اجتماع کا قائم رہنا اور انسان کی موت کیا ہوتی؟ انہی عناصر کا منتشر ہو جانا۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترکیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

لیکن اگر انسان حقیقۃً کوئی اور چیز ہے تو اسکی زندگی کچھ اور ہوگی اور موت کچھ اور ہوگی۔

یہ عجیب بات ہے کہ قدرت نے انسان اور دوسرے حیوانات میں ایک خاص امتیاز اور تفرقہ قرار دیا ہے۔ دوسرے حیوانات ایسے ہوتے ہیں کہ شکم مادر سے نکلتے ہی انکی حس و حرکت کمال پر ہوتی ہے۔ حیوانات کے بچے محتاج نہیں ہوتے کہ جب بڑے ہوں تب اُن میں حس و حرکت و ارادہ پیدا ہو بلکہ اس حیثیت سے کوئی تفرقہ اُن میں باعتبار منازل عمر کے نہیں ہوتا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کا بچہ جس وقت شکم مادر سے متولد ہوتا ہے تو اسکے تمام احساسات بیکار و معطل ہوتے ہیں۔ آنکھ ہوتی ہے مگر ٹھہرتی نہیں۔ ہاتھ ہوتے ہیں مگر ارادہ کے تابع نہیں، قابو میں نہیں ہوتے۔ اُٹھتے کسی پر ہیں اور پڑتے کسی پر ہیں۔ پاؤں ہوتے ہیں مگر چلنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ حرارت و برودت کا حس بھی مشکل سے ہوتا ہے۔ یہ آخر کیا ہے؟ دوسرے حیوانوں کے بچے تمام قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ مگر انسان کا بچہ تمام قوتوں سے تہی دست ہوتا ہے یہ درحقیقت رد ہے نظریۂ ارتقاء کی۔ اگر ترقی کا فلسفہ درست ہوتا تو کل قوتیں پوری قوت کے ساتھ آتیں۔ اور اس کے بعد ان میں اضافہ

ہوتا لیکن انسان میں قوت کا معدوم ہونا۔ اور رفتہ رفتہ آنا یہ بتلاتا ہے
کہ اسکی ابتدا بھی یہیں سے ہے۔ اور انتہائی ترقی بھی یہیں ہے۔ یہ جو کچھ
کمال حاصل کرتا ہے وہ پس ماندہ اموال کی طرح نہیں ہے کہ جو مورث اعلیٰ
سے اسکے ہاتھ آتا ہو۔ بلکہ جتنے کمالات ہیں وہ اسکی ذاتی طاقت و قوت
کے نتائج۔ وہ اپنی موجودہ طاقت سے ہی آگے بڑھتا ہے۔ اور حد کمال تک
پہونچتا ہے۔ بے شک انسان سلسلہ ارتقا میں آتا ہے۔ میں بھی اس کا قائل
ہوں یعنی جمادات سے بڑھ کر انسان تک پہونچتا ہے۔ خالق کائنات
نے جو نظام قرار دیا ہے اسکی بنا پر دانہ زمین میں بویا جاتا ہے تو زمین کے
ذرات ہی ہوتے ہیں جو رطوبتوں کو جذب کر کے فیض مجاورت سے نبات
کی شکل اختیار کرتے ہیں۔

اسکے بعد جسم نامی ہے کہ جو شجر یا بار یا مختلف قسم کی گیاہ کی شکل میں
ہوتا ہے وہی جز ہوتا ہے جسم حیوانات کا۔ جو چیزیں فضلات میں سے
ہوتی ہیں وہ علیحدہ ہو جاتی ہیں اور جو جوہر ہوتا ہے وہ خون میں تبدیل
ہو کر جسم میں دوڑتا ہے اور نبات تھا جواب ترقی کر کے جسم حیوان کا
جزو ہوتا ہے۔

اسکے بعد حیوانات سے تغذیہ ہوا اور وہ جسم انسان کا جزو ہوئے
یعنی اُن کے گوشت سے انسان کی غذا حاصل ہوئی۔ خون صالح پیدا ہوا۔ اس سے

انسان میں اُس جوہر خاص کی خلقت ہوئی جس سے انسان کی تشکیل ہوتی ہے۔ کیا ہوا؟ بے شک یہ ہوا کہ جماد ترقی کر کے انسان کے درجہ تک پہونچا۔ لیکن انسان کے درجہ تک نہیں جسم انسان کے درجہ تک پہونچا۔ یہ سب منازل جسم انسان کی ساخت تک ختم ہو جاتے ہیں۔ اور جسم انسان کی ساخت وہی ہے جس کو قدرت نے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

انا خلقنا الانسان من سلالة من طين "ہم نے انسان کو مٹی کے تپلے کی صورت میں پیدا کیا"

یہ سب سے پہلی مرتبہ کی خلقت یعنی خلقت آدم کا ذکر ہے جس سے ہمیں مطلب نہیں،

ثم جعلناه نطفة فی قرار مکین۔ اسکے بعد ہم نے یہ نظام قرار دیا کہ۔ اسکو ہم نے نطفہ بنایا اور قرار دیا ایک پرسکون استقرار کی جگہ (بطن مادر) میں۔

فخلقنا النطفة علقة یہ جسم انسان کی ساخت کی ترکیب بیان ہو رہی ہے۔ کہ "ہم نے اُس نطفہ کو علقہ کی شکل میں تبدیل کیا"

فخلقنا العلقة مضغة "پھر ہم نے اُس علقہ کو ایک گوشت کی ٹکڑے کی شکل میں تبدیل کیا فخلقنا المضغة عظاما فکسونا العظام لحما "اُس گوشت کے ٹکڑے میں ہڈیوں کا ڈھانچہ تیار کیا اور اُس پر

ہم نے باریک گوشت کا غلاف چڑھا دیا۔ یہ تمام مدارج وجود جسم انسانی ہیں۔ منزل تیار ہو رہی ہے۔ مکیں نہیں بن رہا ہے گھر تیار ہو رہا ہے رہنے والا لاکر اتارا جائے گا قفس کی ساخت ہے بلبل سدرہ نشین اسکے علاوہ ہے یہ نہ سمجھے گا کہ انسان بن رہا ہے۔ ہیکل انسانیت تیار ہو رہی ہے۔ اطبا کو جو نسخہ عزیز ہوتا ہے دوسروں کو بتاتے نہیں ہیں مگر کتنا مقتدر ترکیب دینے والا ہے کہ نسخہ لکھکر پیش کر دیتا ہے۔ ترکیب بھی بتا دیتا ہے۔ ترتیب بھی بتا دیتا ہے اگر ہاتھوں میں دم ہو بنا لو۔ مگر اسکے بعد نہیں معلوم کون سی عزیز سے عزیز تر چیز تھی جسے بتانے پر تیار نہیں ہے۔ سب کچھ بتا دیا۔ اگرچہ پردہ کی بات تھی، بنایا تھا حجاب کے اندر مگر بتانے میں کوئی عذر نہیں کیا۔ لیکن اب نہ معلوم کون سا پردہ ہے کہ الفاظ بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ منزل قریب آگئی تھی دنیا مشتاق تھی۔ عالم جاننا چاہتا تھا کہ یہ کیا ہے؟ اُمیدیں بندھ گئی تھیں اسلئے کہ سیاق کلام اُمید افزا تھا۔ اسوقت قدرت مصروف اظہار تھی۔ بیان ہو رہی ہے ترکیب ساخت انسانی تفصیل کے ساتھ کوئی جز چھوڑا نہیں جاتا جتنی کڑیاں ہیں ایجاد کی سب بیان ہو رہی ہیں ابتدا بھی بتائی وسط بھی بتایا۔ آخر بھی بتایا۔ سب کچھ بتایا یقین ہو گیا کہ جو پوچھنا چاہتے تھے وہ معلوم ہو جائیگا لیکن۔ نقطۂ قلم بیان اس

غلاف کی تکمیل تک۔ یا اُس پردہ تک جو اس مجمل وجود انسانی پر چڑھا گیا تھا۔ آکر منتہی ہو گیا۔

اس حجاب قدس میں آکر اترے گا کون؟ کون ہے اس منزل کا مکیں؟ وہ معلوم ہونے کی دیر ہے۔ لیکن یہاں تک پہونچتے ہی انداز کلام بدل گیا تفصیل ابہام کی طرف منتقل ہو گئی۔ پردہ ڈالدیا گیا ثم انشأناہ خلقا آخر "پھر ہم نے اُسے کچھ اور بنا دیا"

یہ کچھ اور کیا ہے؟ وہ وہی ہے جس کی ابتدا ابھی ہم کو نہیں معلوم۔ اور انتہا بھی ہم نہیں جانتے۔ وہ وہی ہے۔ جو کچھ اور ہے۔

انشأناہ خلقا آخر عجیب لفظ استعمال کی ہے اسکے پہلے یہ تھا خلقنا النطفۃ علقۃ۔ خلقنا العلقۃ مضغۃ۔ خلقنا المضغۃ عظاما۔ ہم نے اُسے یوں بنا دیا۔ یوں کر دیا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ کچھ تھا وہ اور اسی کی کچھ حالت میں تبدیلی ہوئی یعنی ایک ہی شے پر دوسری کیفیت طاری کی گئی۔ نطفہ تھا۔ اُسی نطفہ کا علقہ بن گیا۔ اسکو مضغہ بنایا اسی مضغہ میں ہڈیاں پیدا کی گئیں۔

لیکن اب الفاظ بھی بدلتے ہیں "خلقنا" نہیں کہا۔ انشأنا کہا گیا۔ جس سے پتہ چلا کہ یہ چیز وہ ہے جو ماقبل سے بالکل اجنبی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس جسم میں کچھ انقلاب ہوا ہو۔ اور یہ چیز تیار ہو گئی ہو

بالکل نہیں۔ یہ "انشاء" ہے۔ یہ قرار دینا نہیں ہے۔ یہ کسی شے کو کوئی شے
بنانا نہیں ہے بلکہ ایجاد کرنا ہے، "نیست" کو "ہست" کرنا ہے۔
یہ کچھ اور ہی ہے۔ اُمیدیں قطع ہو گئیں۔ نہیں بتایا گیا کہ یہ کیا ہے۔
سب کچھ بتا دیا۔ مگر یہاں آکر سہارا قطع کر دیا گیا۔ پھر کیا۔ کیا جائے دل کی
بے چینی کو۔ بے پوچھے نہیں بتایا تو اچھا پوچھ لیں شاید معلوم ہو جائے
پوچھا گیا۔ مگر یہ بتانا ہوتا تو بے پوچھے ہی کیوں نہ بتا دیتا۔ وہ۔ دنیا کو
معلومات کی بارش سے فیضیاب بنانے والا۔ وہ اگر بتانے میں مصلحت
سمجھتا تو بے پوچھے کیوں نہ بتا دیتا۔ دل کی بے چینی نے سوال کیا۔
یسألونك عن الروح وہ مبداء حیات انسانی۔ روح! کیا چیز
ہے؟ وہ ایک چیز ہے جسکے لئے اس کے مختلف اعراض کی وجہ سے مختلف
نام ہو گئے۔ کبھی نفس کہدیا۔ کبھی "روح" کہدیا۔ کبھی عقل کہدیا۔ وہ
ایک ہی چیز ہے جیسے اُس کا خالق حضرت احدیت ہے آپ کسی
صفت کو دیکھکر "قہار" کہدیا کسی صفت کو دیکھکر "جبار" کہدیا۔
کسی صفت کیلئے "رحمان" کہدیا۔ ہے ایک ہی صفات کا مجموعہ نہیں ہے،
صفتیں اُسکی ذات میں داخل نہیں ہیں۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ ان صفتوں کو
ہم نے جان بھی لیا۔ تو اُسکو بالکل نہ جانا۔ مگر اُسکے آثار رحم و کرم مختلف
آثار کو دیکھ دیکھ کر ہم نے مختلف اوصاف قرار دے لئے۔ اور انہی سے

ہم اُسے جانتے ہیں۔ روح انسانی میں بھی یہی صورت ہے کہ کسی اثر کو دیکھکر عقل کہدیا کسی کو دیکھکر نفس کہدیا کسی کو دیکھکر روح کہدیا۔ آثار کو دیکھکر نام رکھ لئے۔ مبدأ حیات ہے اسلئے روح کہا۔ صاحب ادراک ہے اسلئے عقل کہدیا۔ مدبر جسم ہے اسلئے نفس کہدیا۔ پھر بھی اُسے نہیں جانا جسکے یہ سب نام رکھ دئے اسلئے پوچھا "یہ روح کیا ہے؟" خاطر شکنی منظور نہ تھی کہ جھڑک دیا جائے۔ روک دیا جائے۔ بتایا گیا۔ مگر بتایا گیا تو اس طرح کہ اگر سمجھ ہو تو سمجھے۔ یہ ارشاد ہوا قل الروح من امر ربی "روح میرے خدا کی ایک بات ہے" بس! روح کو کون سمجھے۔ خاموش تو ہو گئے سب اسلئے کہ بتانے میں عذر نہیں کیا گیا۔ لیکن سمجھا کون؟ حقیقتہً پردہ کی بات پردہ میں رہی۔ وہ سب کیوں بتا دیا گیا۔ اور انسان کی حقیقت کیوں نہ بتائی گئی؟ جواد و کریم خدا اُس کو بخل سے کیا علاقہ پھر بتانے میں کیا حرج تھا۔ کیوں پردہ ہی میں رہنے دیا گیا؟ اسلئے کہ انسان انسان رہے۔ اگر بتادیا جاتا تو مقصد فوت ہو جاتا انسانکی انسانیت کا جوہر گم ہو جاتا۔ خود اختیاری علمی وعملی ترقی، یہی وہ چیز ہے جس کے سبب سے انسان انسان ہوا ہے یعنی جماد۔ نبات اور حیوان سب سے انسانکو امتیاز حاصل ہوا ہے۔ اور پھر ایک اور صنف بڑی معزز و محترم صنف یعنی صنف ملائکہ۔ اس سے بھی انسان کو اشرف قرار دیا گیا۔ کیا بات تھی۔ یہ انسان!

اسمیں کیا صفت تھی کہ سب سے ممتاز قرار دیدیا گیا۔ مجھ کو یہی تو بیان کرنا تھا مگر ابھی تک نہیں بیان کر سکا جس کے لئے فکروں اور عقلوں نے اتنی ٹھوکریں کھائیں یہ کیا چیز ہے؟ جسکے لئے سوال کیا۔ اتنی مرتبہ ناکامی اُٹھانا پڑی۔ یہ انسان کیا ہے؟ یہ انسان! وہ جوہر قدس وہ جوہر لاہوت، وہ عالم علیٰ کی چیز ہے جو اس جسم کیساتھ وہ تعلق نہیں رکھتی جو ایک مظروف کو ظرف کے ساتھ ہوتا ہے۔

آپ کسی گھر کے اندر ہوں آپ کا اُس مکان کے ساتھ تعلق جسمانی ہے یعنی اُسکے احاطہ میں ہیں اور یہ آپ کو گھیرے ہوے ہے۔ ایک ڈبیا آپ کے قبضہ میں ہوتی ہے۔ کیا معنی قبضہ میں ہونے کے؟ یعنی آپ کی اُنگلیوں میں ہے۔ آپ کے ہاتھ کے اندر ہے؟

روح جسم میں اس طرح تو نہیں ہے جیسے ڈبیا میں گھڑی ہوتی ہے یا جیسے مکان میں آدمی۔ اسی طرح سے روح ہے جسم کے اندر تو ذرا تشریح کیجئے اعضاء کی۔ ڈاکٹری میں اب ذرہ ذرہ الگ کر لیا جا سکتا ہے۔ ڈھونڈھئے کہاں ہے روح؟ اس روح انسانی کا محل کہاں ہے؟ ڈھونڈ ڈالئے کہیں روح کا پتہ نہیں لگے گا۔ کہاں ہے؟ کہیں نہیں ہے تو کیا واقعی نہیں ہے؟ نہیں ہے تو ضرور۔ پھر کیا ہر جگہ ہے؟ اس طرح کہ اُسکے جز تقسیم ہوں۔

تھوڑی روح ہاتھ میں ہے۔ تھوڑی پیر میں۔ تھوڑی سینہ میں اور اسی طرح؟ اگر ایسا ہے تو ہاتھ کاٹ ڈالئے۔ اتنی روح جسم سے الگ ہو جائے۔ پیر کاٹ ڈالئے اتنی روح جدا ہو جائے۔

ایسا تو نہیں ہے سوائے بعض مخصوص اجزا کے جن کے کٹنے کے بعد جسم کی بنیاد باطل ہو جاتی ہے اسلئے روح پورے جسم ہی سے ساتھ چھوڑ دیتی ہے کوئی جزو ایسا نہیں کہ اسکے کٹنے سے روح میں کمی پیدا ہو۔ پھر کیا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ماننا پڑے گا کہ ہے ضرور مگر اجزا تقسیم نہیں ہیں کسی خاص جگہ نہیں ہے کہ وہ جگہ اسکا محل قرار پائے کسی جزو سے خصوصیت نہیں رکھتی۔

بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ "ہے اور کہیں نہیں ہے" یہ معنی ہیں "لامکاں" ہونے کے جو صفت الٰہی کا ایک ظاہری پرتو ہے۔ یہ جوہر قدس جسکے لئے شیخ الرئیس بوعلی سینا نے کہا ہے۔

هبطت الیک من المحل الارفع ورقاء ذات تعزز و تمنع

اترا ہے تیری طرف عالم بالا سے یہ بلبل یہ قمری۔ یہ طائر سدرہ نشین اترا عالم بالا سے اور آتے ہی اس نے اس جسم کو نغموں سے معمور کر دیا۔ آتے ہی کایا پلٹ کر دی لوگ کہتے ہیں ایک سے بت آشنا نظاہر نہیں ہو سکتے مگر نہیں معلوم یہ ایک آنے والا کیسا تھا کہ جس نے دنیائے جسم

میں انقلاب پیدا کر دیا۔

آنکھیں تھیں اُنکے حلقے بھی تھے۔ کان بھی تھے۔ اُنکے پردے بھی تھے۔ اعصاب بھی تھے اور اُنکی رگیں بھی تھیں۔ مگر کچھ نہیں تھا یہی ایک آنے والا تھا۔ کہ جس نے آتے ہی آنکھوں کو قوت بصارت دی۔ کانوں کو قوت سامعہ دی۔ پیروں میں قوت حرکت دی۔ سب کو ایک نئی حیثیت میں کر دیا اور پھر ہر جگہ اثر دکھلایا۔ آنکھوں میں آنکھوں کی مناسبت سے اثر۔ کانوں میں کانوں کی مناسبت سے۔ ہاتھوں میں ہاتھ کی مناسبت سے۔ کہیں دھوکا نہیں کھایا۔ آنکھوں کو قوت سامعہ نہیں دیدی۔ کانوں کو قوت باصرہ نہیں دے دی۔ جو جس کا حق تھا اُسی کو عطا کیا۔ اُدھر سے آنے والے کی یہی شان ہوتی ہے۔ جو اُدھر سے مقرر ہوتا ہے وہ ہر راہ کی حالت سے۔ ہر ظرف کے لحاظ سے ہر محل کی مناسبت سے واقف ہوتا ہے۔ یوتی کل ذی فضل فضلہ جو جسکے مطابق، جو جسکے لائق وہ اُسی شان سے عطا کرتا ہے۔ یہ روح مجرّد، یہ نفس ناطقۂ انسانی یہ خدائی فرستادہ ہے جو جسم انسانی کے اندر متمکن ہوتا ہے۔ یہ ہے انسان۔ یہ ہے سب سے اعلیٰ سب سے اشرف۔ عالم کائنات میں کوئی چیز اُسکے مقابل نہیں جمادات نہیں۔ نباتات نہیں۔ حیوانات نہیں۔ ملائکہ اسکے مقابل نہیں

ملائکہ سے اشرف ہے۔ سمجھنا تو چاہیئے کہ وہ جوہر خاص کیا ہے جسکی وجہ سے
یہ سب سے اشرف ہے۔ دنیا والوں نے بہت عقل آزمائی کی۔ حقیقت
سمجھنا تو بہت دور تھا۔ آثار و خواص پر نظر ڈالی۔ آثار بھی بہت سے تھے
اُن میں جو سب سے ممتاز نظر آیا اُسے فصل ممیز قرار دیا۔

وہ کیا ہے؟ بہت سے لوگوں نے کہا "ناطق"۔ "ناطق" کے معنی؟ بات کرنے والا
تو کیا گونگا انسان نہیں ہے؟ نہیں بات کرنے والا نہیں۔ بلکہ "کلیات"
کا "ادراک" کرنے والا۔ بہت سے لوگوں نے کہا۔ کیا کسی آدمی نے جانور
بنکر دیکھا ہے کہ جانوروں کو "کلیات" کا ادراک نہیں ہوتا؟

بہر حال مختلف خیالات۔ مختلف چیزیں۔ یہ بھی پریشانی طبع کا
نتیجہ ہے۔ یہ تو بچہ بچہ کی زبان پر آگیا کہ انسان کہتے ہیں مدرک
معقولات کو لیکن جو عقل ہی کو نہ سمجھے وہ معقولات کو کیا سمجھے گا۔
بہر حال عقل حیران رہی کہ کیا ہے؟

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ حقیقت کا سمجھنا تو ناممکن ہی ہے
جو کچھ سمجھتا ہے اثر ظاہر کا سمجھنا۔

تو ہم کو ایسی چیز نکالنا چاہیئے کہ جو تمام خصوصیات پر حاوی ہو
انسان کے لئے طرۂ امتیاز ہو یعنی جتنی خصوصیتیں ہوں وہ سب اُسکے
تحت میں آجائیں۔ درحقیقت جب ہم غور کرتے ہیں کہ وہ چیز جو انسان کا

جوہر خصوصی ہے جس نے اسکو تمام دنیا کی چیزوں سے ممتاز بنا دیا ہے۔
وہ کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ وہ علمی و عملی لامحدود ترقی کی صلاحیت
ہے جو خود اختیاری طور پر ہو۔ یہی انسان کا جوہر خاص ہے۔ علمی
و عملی ترقی کی صلاحیت اسمیں سب کچھ وہ ہے جو دنیا نے انسان کا
مابہ الامتیاز قرار دیا ہے۔ جس چیز کو دنیا نے قرار دیا ہے "فکر" و
"نظر" یعنی "ادراک کلیات"۔ معلومات سے مجہولات کا پتہ چلانا۔
یہ ایک شعبہ ہے علمی ترقی کا۔ یہ درحقیقت صلاحیت ترقی علمی کا ایک
کرشمہ ہے۔ نظر۔ فکر۔ ترتیب۔ سب کچھ اسی کے نتائج ہیں۔ بعض
لوگوں نے کہا ہے کہ حیوانات کو ادراک کلیات" بھی ہوتا ہے۔ دلیل
یہ پیش کی ہے کہ ایک جانور مثلاً کبوتر۔ یا کوئی اور۔ ایک مرتبہ بلّی نے
اُسپر حملہ کیا۔ اور اُسکی کسی طرح جان بچ گئی تو اب وہ ہر بلّی سے ڈرنے
لگے گا۔ یعنی جب وہ کبھی بلّی کو دیکھ لے گا۔ خوف زدہ ہوگا۔ وہ تو ایک ہی
بلّی تھی جس نے اُسپر حملہ کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اُسکو دیکھکر ایک ہیٔت
کلیہ اُسکے ذہن میں حاصل ہوئی۔ اب وہ جس بلّی کو دیکھتا ہے۔ اُس کو
ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اور دلیل بھی
درست نہیں ہے۔

"مثل" سے "مثل" کی طرف انتقال ذہن یہ بھی ایک خاصۂ فطرت ہے۔

کون جاکر بیٹھا اسکے ذہن میں کہ وہ سمجھتا کہ اس ایک کو دیکھکر صورت کلیہ " ذہن میں راسخ ہوتی ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ ایک بلی نے حملہ کیا۔ اب جو اسکی صورت اسکے حافظہ میں آگئی اب جو اسکے مماثل صورت ہے وہ اسکے ذہن کو اسی پہلے کی طرف منتقل کرتی ہے۔ اور وہی ایک قائم شدہ خیال حافظہ میں ڈرنے کا باعث ہوتا ہے۔ لہذا اس دلیل سے یہ نہیں ثابت ہو سکتا کہ حیوانات میں " ادراک کلیات " ہے۔ اگر ہے تو میں کہتا ہوں کہ کلیات کا عمومی ادراک انسان کا خاصہ نہیں ہے بلکہ نظر و فکر کے ذریعہ سے۔ انتقال تدریجی کے ذریعہ سے وہاں جو انتقال ہے وہ بھی احساسات فطری کے طور پر ہے۔ جو حیوانات کو قدرت سے حاصل ہوتا ہے لیکن خود مختارانہ طور سے مجہول کو حاصل کرنا معلوم سے انسان ہی میں ہے۔ اور کسی میں نہیں تو اب انسان کا جوہر خاص کیا چیز ہوئی؟ تدریجی حیثیت سے علمی و عملی ترقی کرنا۔ قدرت کا کام صرف صلاحیتیں دیدینا اور قوتیں عطا کر دینا ہے لیکن ان صلاحیتوں کو عالم فعلیت میں لانا ان قوتوں سے حقیقی معنوں میں فائدہ اٹھانا۔ یہ انسان کا خود اختیاری فعل ہے یہی وہ چیز ہے جس سے انسان کی انسانیت معرض ظہور میں آتی ہے معلوم ہوا کہ خود اختیاری حیثیت سے علمی و عملی ترقی کرنا یہ انسان کا جوہر خاص ہے۔ وہ جسے کہا جاتا ہے کہ انسان کا مابہ الامتیاز ہے یعنی معلوم سے

مجہول کا پتہ چلانا حقیقتاً علمی حیثیت سے صلاحیت ترقی کا ایک شعبہ ہے۔

یہ وہی ہے کہ جو جوہر خاص انسان کا ہے۔ یہی وہ چیز ہے کہ جس نے ایک طرف تو جمادات۔ نباتات۔ حیوانات سب سے انسان کو اشرف قرار دیا دوسری طرف صنف ملائکہ سے بڑھا دیا۔ صنف ملائکہ پر انسان کو فوقیت حاصل ہو گئی۔ انسان کو کیوں بڑھایا۔ جمادات نباتات حیوانات وغیرہ سے؟ اسلئے کہ ان کی طبیعت میں بلندی اور رفعت ہے ہی نہیں مادہ ہے پھر مادہ میں بلند پروازی کہاں سے آئے؟ جو کچھ ہے پستی ہی پستی ہے۔ بلندی کا نام نہیں۔ ملائکہ وہ بے شک بلند مرتبہ ہستی ہے۔ رفیع المنزلت وجود ہے بھلا کیا حق مجھکو کہ میں ملائکہ کی منزل کو پست کہوں۔ عالم بالا کے رہنے والے سدرہ پر منزل رکھنے والے۔ جوار حضرت احدیت میں بسنے والے انکی منزلت کو میں پست کہوں۔ یہ ناممکن ہے۔ بہت بلند۔ بہت رفیع المرتبہ بہت اعلیٰ منزلت۔ مگر میں نے عرض کیا "خود اختیاری ترقی کی صلاحیت" اختیار کے معنی ہمیشہ دو پہلوؤں کے طالب۔ وجود اور عدم بہست و نبسبت فعل و ترک۔ ملائکہ بہت بلند ہیں لیکن انکی بلندی محل و مرتبہ و منزل کی رفعت ظاہری اعتبار سے ہمارے لئے ویسی ہی ہے۔ جیسے معمار نے یہ عمارت بنائی۔ اسکا کنگرہ وہاں رکھا۔ انٹیں یہاں رکھیں ہے ضرور وہ کنگرہ بلند مگر معمار نے وہاں رکھا۔ ہے بلند۔ تعریف ضرور

گردن گا۔ سب سے پہلے نظر اسی پر پڑے گی۔ مگر کیا وہ خود چڑھکر وہاں گیا۔ اسنے اپنے پیروں سے یہ رستہ بلندی کا طے کیا۔ اُس نے اپنی طاقت سے اس منزل ارتقاء کو حاصل کیا؟ نہیں! معمار نے حکمت اور مصلحت کی بنا پر اسکی منزل وہاں قرار دی۔ غلط گو ہوں گا اگر میں اُسکو پست کہوں۔ وہ ہے بلند لیکن تعریف ویسی ہی کروں گا جیسی موتی کے آب و تاب کی۔ ایک صفت ہے جو ہے۔ بلند ہے منزل۔ بطور بیان واقعہ کے بلندی کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ لیکن بطور ثنا و ستائش کے ہیں کمال کا اعتراف کرلوں کہ "بڑا کمال کیا۔ اتنا بلند ہے یہ کنگرہ" یہ ناممکن ہے۔ اسلئے کہ بنانے والے نے بلند ہی رکھا۔ اختیاری حیثیت سے بلند ہوتا تب میں تعریف کرتا لیکن جب رکھا ہی گیا بلند تو پھر اسکی تعریف کیسی؟ ویسے ہی انسان کے مقابلہ میں ملک۔ بلند ہے۔ لیکن پیدا ہی کیا گیا بلند منزل میں یعنی منزل ظاہر میں بلند۔ وہاں کی یہ بلندی رمز ہے انسان سے اُس کے بست درجہ پر ہونے کی۔ اُسکی پاک و مقدس ذات ہے۔ اسکی ذات میں عصیان کا وجود نہیں ہے لیکن بایں معنی کہ قوت عصیان خلق ہی نہیں ہوئی۔ طاقت گناہ پیدا ہی نہیں کی گئی صاف و شفاف۔ جسکے دامن پر کوئی دھبا نہیں۔ بالکل پاک و منزہ۔ لیکن انسان کے مقابلہ میں ملک ناز کرسکے؟! ناممکن ہے۔ تمام ملائکہ بے شک بہت بڑے درجہ پر۔

بہت منزہ اور معصوم لیکن اُنکی عصمت خود اختیاری نہیں ہے۔ پیدا کئے گئے معصوم۔ ہیں معصوم۔ انھیں معصوم نہ کہوں تو ویسا ہی ہے جیسے اس کنگرۂ بلند کو پست کہوں۔ بے شک معصوم۔ لیکن عصمت اُن کی مخلوق۔ جیسے وہ خود مخلوق۔ مگر۔ انسان۔ متحارب قوتوں کا مالک ایک جنگ ہے جو اس مختصر سی دنیائے جسم انسانی میں برپا رہتی ہے ایکطرف نفس امارہ کی طاقتیں ہیں۔ وہ اپنی طرف لیجانا چاہتی ہیں۔ ایک طرف عقل کا لشکر ہے وہ اپنی سی چاہتا ہے کہ کر کے رہے۔ یہ تصادم ہے۔ برابر کی طاقتیں ہیں۔ اُس طرف جہل ہے۔ اس طرف عقل ہے۔ ان متحارب طاقتوں میں انسان رکھا گیا ہے کہ وہ اپنی نظر سے امتیاز کر کے ساتھ دے۔ انا ھدینٰاہ السبیل اما شاکرا و اما کفورا یہ ہے انسان کی قوت امتیاز کا امتحان۔ یہ ہے انسان کی انسانیت کی کسوٹی۔ یہاں اگر انسان کی انسانیت ظاہر ہوتی ہے۔ اب اگر انسان نے ان تمام متحارب قوتوں کو دیکھ بھال کر ایک کا ساتھ دیا۔ دوسرے سے بیزاری اختیار کی۔ تو کیا کہنا۔ پھر تو لڑ بھڑ کر فتح کرنے والا ظفریاب مجاہد ہے۔ راستہ چلتے کوئی مال و دولت ہاتھ نہیں آگیا ہے۔ بلکہ اپنے قوت بازو سے جنگ کر کے فتح و ظفر حاصل کر کے۔ ملک طاعت پر قبضہ کیا ہے۔ یہ انسان ہی ہے ملک کے سامنے آتا ہے۔ فتح مندی کا نشان سر پر لہراتا ہوا آتا ہے

ملک سے کہتا ہے۔ جو ملک تم کو دیا گیا تھا۔ بغیر لڑے بھڑے ہوئے صرف عطیہ کے طور پر۔ اسکو ہیں نے لڑ بھڑ کر فتح کیا۔ وہ ملک عصمت ہے اور یہ انسان کی طاعت ہے۔ انسان تمام مختلف قوتوں کا مجموعہ قرار دیا گیا۔ اس مجموعہ میں لاکر ڈالدیا گیا۔

اب جسوقت کہ یہ صحیح وسالم باہر آئے اس سمندر سے اس کشمکش حیات سے اگر یہ کامیاب نکلے تو درحقیقت اس قابل ہے کہ فخر کرے۔ ناز کرے یہ جو کچھ حاصل کرتا ہے۔ اپنے بازوؤں کی قوت سے۔ انکے پاس جو کچھ ہے وہ دوسرے کا دیا ہوا ہے۔ اس کو جو کچھ ملا اپنی قوت اختیار سے۔ اسکو جو کچھ ملا۔ بس۔ اتنا ہی۔ اس سے زیادہ نہیں ہے۔ انسان حاصل کرتا ہے اور پھر اپنی قوت عمل سے اس کو بڑھاتا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ انسان کی خود اختیاری ترقی۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ملائکہ کے مقابلہ میں اسکو شرف دیدیا۔ ملائکہ علم بھی رکھتے ہیں اور عملی حیثیت سے بھی معصوم ہیں۔ لیکن علم اتنا ہی ہے جتنا دیدیا گیا ہے۔ طاعت بھی اسی حد تک جس پر مخلوق ہوگئے۔ وہ مختلف ہیں۔ انکی شکلیں جدا جدا ہیں۔ اگر کچھ کھڑے ہیں تو کچھ حالت رکوع میں ہیں۔ کچھ حالت سجود میں ہیں۔ مختلف شکلیں مختلف صورتیں جس حالت میں ان کو قرار دیدیا۔ اسکے خلاف کرنے کے لئے دل ہی نہیں۔ دل کے ساتھ خواہشیں

نہیں۔ خواہشات کے ساتھ جذبات نہیں۔ کہدیا۔ کھڑے رہو۔ کھڑے ہوئے ہیں۔ کہدیا جھک جاؤ۔ رکوع میں رکے ہوئے ہیں۔ کہدیا سجدے میں چلے جاؤ۔ سجدے میں ہیں۔

انسان علمی حیثیت سے بھی خود اختیاری ترقی کرنے والا ہے اور عملی حیثیت سے بھی خود اختیاری ترقی کرنے والا ہے اور یہی وہ چیز تھی کہ جب امتحان کا موقع آ گیا۔ ملائکہ سے مقابلہ ہو گیا تو انسان نے اسی جوہر سے کامیابی حاصل کر لی۔ یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر انسان ملائکہ سے بازی لے گیا۔ مقابلہ ہو گیا تھا، وہ مقابلہ جنگ جو یانہ نہ تھا۔ معاندانہ نہ تھا لیکن تھا مقابلہ۔ میزان عدل نے اپنی عدالت کا مظاہرہ کرنے کیلئے ایک مقابلہ کی صورت قرار دیدی تھی اور وہ اسوقت جب پیشین گوئی ہوئی تھی انی جاعل فی الارض خلیفۃ" میں زمین میں اپنا ایک جانشین مقرر کرنے والا ہوں"۔

وہ باتیں نہیں عرض کرنا ہیں جو اس آیت میں بیان کرنے کے قابل ہیں۔ مجھکو تو اپنے محل کلام سے جو متعلق ہو (وہی عرض کرنا ہے۔) ملائکہ نے کہا (مگر قرآن کی وہ آیت یاد رہے) لا یسبقونہ بالقول" بات کرنے میں ارادۂ الٰہی پر سبقت نہیں رکھتے" دامن عصمت پر دھبا نہ سمجھا جائے ان کا کوئی قول ارادۂ الٰہی کے خلاف نہیں ہوتا۔

ہر حال یہ کہا کہ اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفك الدماء
ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك "کیا خلیفہ وہ مقرر کئے جائیں گے
جو زمین میں فساد برپا کریں۔ اور خونریزیاں کریں" یعنی نوع انسان کا
تاریک پہلو ملائکہ کے پیش کیا۔ کیونکہ انسان میں دو پہلو ہوتے ہیں ایک
مادیت کا ایک روحانیت کا مادیت کا تقاضا بے شک وہی امور ہیں
جن میں سے بعض بطور مثال ملائکہ کے قول میں مذکور ہیں۔ جانشینی کے لئے
یہ تجویز ہوا ہے حالانکہ اس میں ایسا عنصر موجود ہے جس کا تقاضا یہ ہے۔
تب ارشاد ہوا انی اعلم ما لا تعلمون بہت مختصر اور مجمل جواب۔
"میں جو جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے"۔
یہ نہ سمجھے کہ ملائکہ کے سوال کو رد کر دیا گیا۔ بلکہ قدرت ملائکہ کی تسکین
کرنے کے لئے جواب کے لئے تیار ہے اور اسی کے لئے سامان کیا گیا۔ پہلے
میں اُن آیات کا ترجمہ جو بہت سے ذہنوں میں ہے وہ پیش کر دوں گا)
وعلم آدم الاسماء کلھا "آدم کو تمام نام بتلا دئے" یہ سامان ہو رہا ہے
جواب دینے کا ملائکہ کی بات کے۔ ثم عرضھم علی الملائکۃ پھر ملائکہ
کے سامنے پیش کیا۔ پرچہ امتحان آیا ہے ملائکہ کے ہاتھ میں۔ اور یہ کہا
جا رہا ہے کہ انبئونی باسماء ھؤلاء ان کنتم صادقین "ذرا یہ نام بتلاؤ
تو اگر سچ کہتے ہو۔ انھوں نے کہا سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا انك

انت العلیم الحکیم "پاک ہے تیری ذات ہمکو نہیں ہے علم۔ مگر اتنا جتنا تونے ہم کو تعلیم کر دیا۔ علم و حکمت تو بس تجھ ہی سے مخصوص ہے۔

قال یا ادم انبأهم باسمائهم خطاب حضرتِ احدیت ہوا آدم سے "اے آدم انھیں تبلاؤ تو نام" فلما انبأهم باسمائهم جب آدم نے نام تبلا دئے تو قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السموات والارض واعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون "

ارشاد حضرت احدیت ہوا " میں نے نہیں کہا تھا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے " ملائکہ کی بات کا جواب ہو گیا۔ لیکن ذرا غور تو کیجئے صورت واقعہ یہ کہ ہے کیا؟ دنیا نے جو معنی آیت کے سمجھ رکھے ہیں۔ اُس کی بنا پر نتیجہ کیا ہوا؟ ملائکہ نے اعتراض کیا کہ انسان کو ہمارے مقابلہ میں کیا فوقیت۔ ہم تیری تہلیل کرتے ہیں۔ تسبیح کرتے ہیں انسان ہمارے مقابلہ میں کیوں منصب خلافت میں پیش کیا جاتا ہے انی اعلم ما لا تعلمون کہکر ٹال دیا جاتا تو پھر بھی پردہ میں رہتا کہ جواب کیا دیا۔ نہیں بلکہ قدرت جواب دینے کے لئے تیار ہے۔ جواب کے لئے سامان کیا کیا گیا؟ کہ آدم کو چپکے سے تبلا دئے "اسماء" تعلیم دیدی گئی۔

اب ملائکہ سے پوچھا جا رہا ہے۔ " ذرا تبا نا تو " ملائکہ کو تو تبایا

نہیں۔ آدمؑ کو "اسماء" تعلیم کر دئے علّم آدم الاسماء کلھا ثم عرضھم علی الملائکۃ یہ تو ہے نہیں کہ آدم کو بتایا اور ملائکہ کو بھی ملائکہ کو تو نہیں بتایا۔ آدم ہی کو بتایا۔ اور پوچھا جا رہا ہے۔ ملائکہ سے "اے میرے ملائکہ تم ذرا یہ نام بتلاؤ"۔ تو اب ملائکہ کیا کہیں گے؟ اسکو جانے دیجیے کہ انھوں نے کیا کہا۔ آپ اپنے مقام پر کیا کہتے ہیں۔ اس سے تھوڑی دیر کے لئے قطع نظر کر لیجیے کہ خدا کا معاملہ ہے۔ سمجھیے کہ خدا نہیں کوئی اوستاد ہے اس نے اپنے ایک شاگرد کو اپنا قلمدان وزارت سپرد کر دیا ہے۔ دوسرا شاگرد اعتراض کرتا ہے "یہ نافہم شاگرد ہے۔ اس کو ہمارے مقابلہ میں امتیاز خصوصی عطا کر دیا۔ حالانکہ ہم اس سے زیادہ مستحق ہیں"۔

اوستاد کو اس اعتراض کا جواب مدنظر ہے۔ وہ پہلے شاگرد کو چپکے سے گوشہ میں لے جاکر کچھ خاص رموز بتلا دیتا ہے۔ اسکے بعد آتا ہے میدان مقابلہ میں۔ دوسرے شاگردوں سے وہی بے بتائی ہوئی باتیں دریافت کرتا ہے "بتاؤ تو اگر تم سچے ہو" وہ بیچارے کیا جانیں انکو تو بتایا گیا ہی نہیں۔ اب آپ کیا فیصلہ کریں گے۔ کہیں گے کہ اُستاد نے بے انصافی کی۔ یا نہیں؟ ہر صاحب عقل کہے گا کہ اُستاد نے بے انصافی کی۔ اگر امتحان لینا تھا۔ تو لطف تب تھا کہ پہلے شاگرد کو بھی نہ بتایا

ہوتا - اب چاہے ظاہر میں آپ بات بنالیں - مگر درحقیقت عالم انصاف میں دنیائے عدالت میں - کچھ جواب نہیں ہوتا - اُن شاگردوں کا اعتراض اپنی جگہ پر قائم ہے -

مگر کیا ایسا ہی ہوا ؟ اگر آیت کے دنیا نے جو معنی سمجھے ہیں - یہی ہیں - تو پھر خدا کا طرز عمل اس اُستاد سے کچھ الگ نہیں ہے - یہ چیز بہت سے دماغوں میں گردش کرتی ہوگی کہ آخر یہ کیا ؟ ملائکہ کا آدمؑ سے مقابلہ تھا - یہ بھی خدا کے مخلوق - وہ بھی خدا کے مخلوق تھیں - ایں بھی جو کچھ فیض پہونچ رہا ہے - یا پہونچے گا - وہ بھی اسی کی ذات سے - وہ پرانے شاگرد یہ نئے شاگرد - وہ برسوں کے تعلیم یافتہ یہ ابھی عالم وجود میں آئے - اور ابھی عالم ہستی میں قدم رکھا - اب اُن سب کے حقوق کو پامال کر دیا جاتا ہے - اس طرح کہ اس نو کار شاگرد کو - نوآموز مکتب نشین کو چپکے سے تبادیا جاتا ہے اور اسکے بعد کہا جاتا ہے کہ " تباؤ تو اس بات کو" اب وہ کیا جواب دیں - اگر انھیں پتہ نہ چلا کہ اس پہلے شاگرد کو تبادیا ہے تب تو وہ شاید خاموش ہو جائیں لیکن اگر پتہ چل گیا تو پھر جواب میں یہی کہیں گے کہ " حضور ! ہمیں بھی تبادیا گیا ہوتا تو ہم بھی تبادیتے " اب آیت کا مطلب جو دنیا نے سمجھا ہے - اسکی بنا پر ملائکہ نے یہی جواب بھی دیا - قالو سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا ہم تو تنا ہی

بتا سکتے ہیں۔ جتنا تو نے بتا دیا ہے" اسکے معنی یہ ہوئے کہ امتحان غلط ہو گیا۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ ملائکہ جواب دے گئے قدرت کی بات کا۔ حقیقتاً اُن کا جواب لاجواب ہے۔ قالوا لا علم لنا الا ما علمتنا۔ "اُنھوں نے کہا۔ ہم بھی تیرے بتلانے کے محتاج ہیں۔ تیرے شاگرد ہیں۔ الگ سے کہاں سے لائیں" اب علم آدم الاسماء کے ساتھ اس جواب کو لگائیے تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ انہیں تو تو نے بتا دیا۔ ہم کو بتایا نہیں تو ہم جواب کیونکر دیتے!"

اس واقعہ کی بنا پر پہلے ہی ممتحن کا طرز عمل عادلانہ تھا۔ اب جس وقت کہ ملائکہ نے سچا جواب دیا۔ قدرت کو خاموش ہو جانا چاہیے تھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ملائکہ امتحان کے بے اصول ہونے کا اظہار کر رہے ہیں مگر قدرت ہے کہ امتحان کی کرسی سے اب بھی نہیں ہٹتی۔ اب بھی پرچہ بدلا نہیں جاتا۔ اور زور پڑ رہا ہے قال یا آدم انبأھم باسمائھم ملائکہ بیچارے کہہ رہے ہیں ہم کو بتایا نہیں گیا۔ ہم کیسے بتائینگے۔ مگر قدرت ناز کے ساتھ کہتی ہے " ہاں! آدم! ذرا بتا تو دنیا" (تو کونسا کمال ہے بتا دینا!)

اب آدم کو کیا تھا سکھائے پڑھائے ہوئے تو تھے ہی۔ فر فر نام سنا دیے۔ نام بتا دیے۔ خبر دیدی۔ اچھا اتنا ہی سہی غنیمت تھا لیکن

قدرت آپ اپنی فتح کا اعلان بھی کرتی ہے۔ حالانکہ اُنھوں نے شکست تسلیم نہیں کی۔ اسلئے کہ۔ کہا کہ "اگر دونوں کو یہ بتایا گیا ہوتا تب مزا تھا۔ مقابلہ کا" اب اگر شکست ہوی تو یہ شاگرد کے مقابلہ میں شکست نہیں ہوئی۔ آپ کے مقابلہ میں شکست ہوی۔ لیکن قدرت گویا اُنکی شکست ظاہر کرتی ہے اُنکے مقابلہ میں اعلان کرتی ہو الم اقل لکم انی اعلم غیب السموات والارض واعلم ماتبدون وماکنتم تکتمون" دیکھو! میں نہ کہتا تھا کہ میں جو جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے" تو کیا ہوا؟ یہ تو صرف دعاوی ہی دعاوی ہیں قدرت کی جانب سے (معاذ اللہ!) آخر کیا جواب دے گی دنیا قدرت کی طرف سے کیونکر حمایت کرے گی۔ حکمت باری کیونکر محفوظ رہے گی۔ کیونکر عدالت کو صدمہ نہ پہنچے گا۔ یہ تو ظلم ہے۔ آپ کو بتا دیا۔ آپ کو بتایا نہیں۔ وہ جواب دے رہے ہیں۔ پھر بھی فتح کا اعلان ہو رہا ہے۔ یہ تو کسی عاقل کے کرنے کی بات نہیں ہے کہ باوجود اپنی شکست کے ظاہر ہو جانے کے پھر بھی دعویٰ کرے کہ درحقیقت تم کو شکست۔ اس صورت میں دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آخر کھلا کیا حقیقت امر کیا تھی۔ یہ امتحان کیسا تھا۔ قدرت کی فتح کیونکر ہوی۔ ملائکہ کی شکست کس طرح ہوی اسکے لئے ضرورت ہے کہ میں آیت قرآن کا سبق ایک مرتبہ اور پڑھوں۔ اسلئے کہ دنیا نے کتنی مرتبہ نظر ڈالی ان آیات پر۔ تفسیریں لکھی گئیں۔

مگر دنیا نے ان ظاہری لفظوں کے ترجمہ کو بھی ابتک نہیں سمجھا. شروع کیجئے آیت کو ابتدا سے۔

علّم آدم الاسماء کلّھا "تعلیم کئے آدمؑ کو تمام نام" نام کیا تھے؟ لوگوں نے کہا "تمام مفرد الفاظ" ہر شے کے نام۔ کیا یہی بتایا گیا تھا ملائکہ اور آدمؑ کا مقابلہ۔ اور اس میں فرہنگ لغت کا امتحان! بہر حال نام۔ "الاسماء کلّھا" "تمام نام تھے" اور اسی بات سے تمام دنیا نے دھوکا کھایا ہے کل کی لفظ عموم و شمول چاہتی ہے لیکن ذرا سی غلط فہمی ہوئی "کل" اتنے ہی دائرہ میں عموم و شمول چاہتا ہے جو اسکے قبل کے الفاظ سے مراد لے لیا گیا ہے اگر "الاسماء" میں "ال" عموم و شمول کا ہے یعنی "تمام دنیا کے نام" تو بیشک آیت اسمیں عموم و شمول پیدا کرے گی لیکن اگر "اسماء" پر "ال" عہد کا ہے یعنی "اسماء" سے کچھ خاص اسم مراد ہیں تو "کلّھا" اتنے ہی دائرہ میں آکر عموم پیدا کرسکتا ہے۔

"کلّھا" کے معنی ہیں "سب کا سب" اسکے قبل کے لفظ کو دیکھئے۔ "دنیا کو کہا سبکی سب" اسمیں ایرانی۔ افغانی۔ جاپانی۔ یوروپین سب داخل "اہل ایشیا کو کہا سب کے سب" "سب کا سب" کا لفظ نہیں بدلا مگر بتائیے اس میں یورپ والے بھی داخل ہیں "اہل ہندوستان سب کے سب" سب کے سب کا لفظ تو وہی رہا۔ مگر اب ایشیا کے اور دوسرے مقامات والے

لوگ سب نکل گئے " اہل اودھ سب کے سب " دہی سب کے سب " اسمیں تغیر نہیں ہے وہ اب بھی محفوظ ہے۔ مگر اب " سب کے سب " میں پنجاب والے نہیں داخل ہیں۔ صرف اودھ میں محدود۔ " اہل دہلی سب کے سب " اہل لکھنو سب کے سب " اسمیں اب فیض آباد والے داخل نہیں ہونگے۔ اہل محلہ " سب کے سب " " حاضرین سب کے سب " اب کوئی بھی جو یہاں حاضر نہیں ہے۔ داخل نہیں ہو سکتا۔ یہاں " الاسماء " سے اگر آپ جمادات نباتات۔ حیوانات سب کے نام مراد لے لیجئے تو بیشک " کلہا " اسمیں عموم لائے گا یعنی استثناء نہ رہے گا لیکن اگر " الف لام " آیا ہے عہد کا اور اُس سے اشارہ خاص کی طرف منظور ہے۔ یعنی تلك الاسماء کلھا " وہ نام سب کے سب " اب " سب کے سب " عموم و شمول کا ذمہ دار نہیں رہے گا جب تک کہ " وہ " کو نہ دیکھ لیجئے۔ نواب " وہ " کون ہیں۔ میں ہاتھ سے اشارہ کرتا ہوں وہ حضرات " سب کے سب " بے شک " وہ حضرات " کو دیکھئے کہ میں نے دس کی طرف اشارہ کیا۔ یا بارہ کی طرف اشارہ کیا " سب کے سب " اُسی دائرہ میں آکر عموم و شمول پیدا کرے گا کہ اُن میں سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے بہر حال۔ اُن اسماء میں جنھیں تبلانے کو کہا تھا کوئی نہیں چھوٹیگا لیکن وہ کون۔ خاص اسماء ہیں۔ " وہ اسماء بتاؤ " بتا دئے۔ اب آتا ہے وہ لفظ جس کو دنیا نے نہیں دیکھا۔ ثم عرضھم علی الملائکۃ " اسم "

کی جمع اسماء ہے اور جمع حکم تانیث میں ہوتی ہے۔ شاہد یہیں پر موجود ہے
علم آدم الاسماء کلہا آدم کو تمام نام تبلائے۔ یہاں اسماء کی طرف ضمیر
پھیری گئی ہے "کلہا" مونث کی کلہم نہیں کہا گیا ہے اور نہ صحیح ہے۔

اسکے بعد ہونا یہ چاہیے تھا ثم عرضہا علی الملائکۃ " انہی ناموں کو
ملائکہ کے سامنے پیش کیا۔ ثم عرضہم علی الملائکۃ مگر قدرت نے
الفاظ بدل دئے۔ اب اسکا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ " پھر پیش کیا اُن لوگونکو
ملائکہ کے سامنے "ھم" ذوی العقول سے متعلق ہے۔ جس کے معنی ہیں
" وہ لوگ" آدم کو تمام نام تعلیم کئے پھر پیش کیا اُن لوگوں کو " دنیا کی
تفسیروں میں سب میں لکھا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اعیان علم یہاں
کیونکر غافل ہوگئے۔ تفسیروں میں لکھا ہے۔ " اسماء" پیش کئے گئے۔
مگر ہے۔ " پیش کیا اُن لوگوں کو " یہ کیا؟ یعنی "نام" کیا لوگ ہوتے
ہیں"؟ پھر وہ نام تو۔ جناب والا! آپکے بقول۔ حیوان بھی اسمیں ہیں
دیواریں بھی اسمیں ہیں۔ در بھی اسمیں ہیں۔ کیڑے مکوڑے بھی اس میں
ہیں۔ " ذوی العقول" سہی مگر انکے نام تو " ذوی العقول" نہ ہوئے
تو اسماء تعلیم کئے۔ پھر اُن لوگوں کو پیش کیا ملائکہ پر یہ عجیب لفظ ہے۔
اسکے علاوہ "نام پیش کئے" فقال نبأونی باسماء ھؤلاء " مجھکو
بتلادو یہ نام جو پیش کئے گئے۔ یہ عجیب لطیفہ ہے۔ پیش بھی کر دئے گئے نام

اور پھر کہا جا رہا ہے کہ بتلاؤ نام یعنی آپ کسی لڑکے سے پوچھیں کہ "ب" کے بعد "ت" کونسا حرف ہے۔ وہ کہدے گا کہ آپنے تو خود ہی بتلا دیا کہ "ت" نام پیش کر بھی دئے گئے۔ اور پھر پوچھا بھی جا رہا ہے کہ ہاں نام تو بتاؤ۔ کیا کہنا اس حکمت کا۔ بہر حال اس صورت میں انبأ وا بھٰذہ الاسماء ہونا چاہیئے یہ "نام بتلاؤ" مگر وہاں یہ ہے انبأوا باسماء ھٰؤلاء "ان لوگوں کو پیش کیا ملائکہ کے سامنے اور یہ کہا کہ ان لوگوں کے نام بتلاؤ"۔

معلوم ہوا کہ وہ معنی جو دنیا والوں نے قرار دئے ہیں لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے آیات قرآن سے بالکل بیگانہ ہیں۔

اب اصل حقیقت معنی پر غور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ مذکورہ بالا آیات پر شروع سے پھر غائر نظر ڈالی جائے۔

علم آدم الاسماء کلھا "آدم کو وہ نام سب تعلیم کئے گئے"۔ نام کن کے تھے۔ بعد کی لفظیں بتلاتی ہیں کہ کچھ ذی روح صاحبان ہوش و خرد یعنی انسانی جماعت سے تعلق رکھنے والی ہستیوں کے نام تھے۔ اسکے بیان کرنے کی مجھے اسوقت ضرورت نہیں کہ وہ ہستیاں کون تھیں۔ یقیناً اگر تھیں تو وہی جو سبب عالم ایجاد ہستیاں سمجھی جا سکتی ہیں۔

ثم عرضھم علی الملائکۃ ملائکہ کے سامنے وہی نام نہیں پیش کئے گئے تاکہ یہ کہا جائے کہ جو آدم کو بتلا دیا گیا تھا وہی اب ملائکہ سے

پوچھا جا رہا ہے۔ بلکہ وہ ہستیاں پیش کی گئیں جن کے نام تھے نام ملائکہ کو پہلے سے معلوم۔ آدم کو بھی نام صرف بتلائے گئے مگر امتحان قوت فراست کا ہے مسمیات دکھائے جا رہے ہیں۔ نام جن کے ہیں وہ سامنے لائے جا رہے ہیں کہ ان ناموں کو دیکھ کر اسمار کی تطبیق کرو یعنی یہ بتاؤ کہ کون نام کس کے ہیں۔ انبأونی باسماء ھؤلاء "ان لوگوں کے نام (معین کرکے) بتلاؤ" یہ چیز بتلائے ہوئے حدود سے خارج تھی۔ ملائکہ کا علم تھا محدود جتنا قدرت کی طرف سے علم حاصل ہوا بس اتنا ہی انکے پاس موجود۔ لیکن معلومات سے مجہولات کا علم حاصل کرنا بات سے بات پیدا کرنا علمی ترقی خود اختیاری حیثیت سے کرنا یہ انسانیت کا خاصہ تھا۔

ملائکہ نے اپنے قصور طبیعت کا اعتراف کیا کہا سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم "بار الٰہا ہم تو اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا ہم کو تو نے تعلیم دیا ہے۔ ہمارے بس کی یہ بات نہیں کہ ہم اس سے زیادہ کچھ بتا سکیں۔"

اب قدرت انسان کی طرف متوجہ ہوئی۔ ہاں انسان! یہ تیرے جوہر کے نمایاں ہونے کا وقت ہے۔ تو نے بھی اگر اتنا ہی بتایا تو ملائکہ میں اور تجھ میں امتیاز ہی کیا ہوا۔

اب تو بتا دے کہ ان ناموں میں سے ان صورتوں کے کون سے نام ہیں

وہی سوال، آدمؑ کے سامنے بھی پیش ہوا جو ملائکہ سے کیا گیا تھا انبائھم باسمائھم" ہاں آدمؑ! تم تو بتاؤ" یہ انسان تھا جو بتائی ہوئی بات سے زیادہ بتا سکتا تھا۔ اُس نے اپنی قوت تمیز سے کام لیا۔ اُس نے اپنے شعور خاص سے کام لیا۔ اُس نے ناموں کو دیکھا مسمیات پر غور کیا مناسبتیں دیکھیں دونوں کے درمیان۔ اسکے بعد یہ بتا دیا کہ یہ اس کا نام ہے۔ یہ اسکا نام ہے۔ اس طرح انسان کو امتیاز ملائکہ کے مقابلہ میں ثابت ہوا۔ انسان کو جتنا بتایا گیا ہو اُس سے زیادہ خود پیدا کرے۔

یہ نقطۂ اول تھا انسانیت کا۔ یہ ابجد تھی درجہ انسانیت کی۔ اسکے بعد انسانیت نے کہاں تک ترقی کی۔ نقطۂ اول وہ تھا جو ملائکہ سے آگے بڑھ گیا۔ اتنی سی بات پر کہ بے بتائے ہوئی بات بتادی۔ وہ ابتدا تھی عالم انسانیت کی۔ اسکے بعد انسانیت نے کہاں تک ترقی کی؟ یہ سمجھ لیجیے۔ قامت آدمؑ کے الف پر ایک کم ایک لاکھ چوبیس ہزار صفر اور آئے اور انسانیت اتنے درجہ بلند ہوئی۔ اسوقت خاتم النبین مبعوث ہوئے۔ اسوقت رسول آخر الزمان دنیا میں آئے۔ اب جو جوہر انسانیت آدمؑ میں تھا وہ کیا گم ہو جاتا؟ اگر وہ معیار فضیلت انسانیت تھا تو آدم نے اگر ایک بتائی ہوئی بات سے ایک بات خود پیدا کی تو اب اس رسول آخر الزماں کا جو وصی ہوگا۔ وہ یہ کہتا ہوا

آئیگا کہ علمنی رسول اللہ الف باب من العلم فانفتح لی من کل باب الف الف باب مجھکو رسول اللہ نے ہزار باب تعلیم کئے۔ مگر مجھ پر ہر باب سے ہزار ہزار باب جو کھل گئے۔ پھر وہ اگر صرف ایک بات بتانے پر مسجود ملائکہ بننے کے قابل ہوئے تو وہ جس نے ملائکہ کے مقابلہ میں اپنی فضیلت ایک سے ہزار ہزار باتیں پیدا کر کے ثابت کردی یقیناً ملائکہ کے مخدوم ہونیکا مستحق ہے اور دنیا اُسکے مقابلہ سے قاصر ہے۔

واضح رہے کہ میرا موضوع بحث مستقل طور سے اس آیت کا بیان کرنا نہیں ہے اگر میرا موضوع بحث یہ آیت ہوتی کہ اذ قال ربک للملئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ الخ اسوقت میرے فرائض آئینی میں سے یہ ہوتا کہ میں اس آیت سے جتنے شعبے متعلق ہیں اور جتنے اجزا قابل توضیح ہیں اُن سب کو بیان کردوں۔ اگر کوئی جز چھوٹ جاتا تو اسکے معنی یہ ہوتے کہ میں نے اپنے موضوع کو ناقص چھوڑ دیا لیکن یہ منزل وہ نہیں ہے۔ سلسلۂ تفسیر قرآن جو یکشنبہ کو پابندی کے ساتھ بیان ہوتا رہا ہے اب دوسرے پارہ تک پہونچا ہے۔ اور یہ آیتیں پہلے پارہ کے قریب نصف کی ہیں۔ وہاں یہ بیان ہو چکی ہیں

ع۵ یہاں سے جو کچھ اس مسئلہ میں کہا گیا ہے وہ اُن مسلسل سوالات کا جواب ہے جو حاضرین میں سے مختلف اشخاص کی جانب سے کئے گئے تھے۔

تقریباً پانچ یکشنبوں تک اسی ایک آیت کی تفسیر بیان کی گئی تھی۔
اور اسکا یہ جز جو نہایت اختصار سے صرف موضوع کلام کی مناسبت
اور محل کلام میں استشہاد کے طور پر آپکے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ وہاں
(یعنی یکشنبوں کے موعظوں کے سلسلہ میں۔ رپورٹر) بیان کیا جا چکا ہے
وہاں یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ خلیفہ کے کیا معنی ہیں؟ ملائکہ نے جو اعتراض
کیا وہ انکے شان عصمت کے خلاف تو نہیں ہے؟ خدا نے جو جواب دیا وہ
سوال کا اقرار تھا۔ یا انکار؟ ملائکہ کا دعویٰ بمقابلہ آدمؑ کہاں تک قابل تسلیم
تھا؟ اسکے بعد یہ جز تھا کہ تعلیم اسماء جو کی گئی تو اسماء سے کیا مراد تھی۔
اور اسکے اوپر یہ شبہ ہوتا ہے کہ آدم کو اسماء بتلا دئے گئے اور ملائکہ
سے بے بتائے ہوئے پوچھے جا رہے ہیں۔ حق انصاف جب ادا ہوتا
جب آدمؑ کو بھی نہ بتایا گیا ہوتا۔ یہ صورت منافی عدل معلوم ہوتی ہے
اور ایک ممتحن کی شان کے خلاف ہے۔ اسکا جواب آپکے سامنے مختصر
طور سے عرض کیا گیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ آدم کو بتایا گیا تھا وہ
اگر ملائکہ سے پوچھا گیا ہوتا تو امتحان غلط ہو جاتا۔ امتحان کا معیار قائم
نہ رہتا۔ جیسا کہ عام مفسرین کی تفسیروں سے ثابت ہوتا ہے یعنی آدمؑ
کو اسماء تعلیم کئے پھر وہی اسماء ملائکہ سے دریافت کئے۔ آدمؑ کو بتا دیا گیا
تھا۔ ملائکہ کو نہیں بتایا گیا تھا۔ ملائکہ بیچارے بتاتے کیونکر۔ انھوں نے

جواب دیا کہ "ہم تو بتانے کے پابند ہیں" اس طرح سے

امتحان امتحان نہیں ہو سکتا سازش ہو جاتی ہے یعنی گویا قدرت

اور آدمؑ میں سازش ہو گئی تھی۔

نہ واقعی کوئی فوقیت آدمؑ کی ملائکہ پر ثابت ہوتی ہے لیکن صورت

حال جو قرآن مجید پیش کر رہا ہے وہ اس سے مختلف ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ آدمؑ کو اسمار تعلیم کئے گئے تھے اور ملائکہ سے صرف

وہ اسمار نہیں پوچھے جا رہے ہیں یعنی جو چیز آدم کو بتائی تھی اسکا سوال

نہیں ہے۔ بلکہ اس بتائی ہوئی چیز کے علاوہ کچھ اور سوال ہے۔ بتائے تو

تھے نام۔ مگر پوچھے جا رہے ہیں وہ جنکے یہ نام ہیں۔ انھیں پیش کر کے دکھایا

جا رہا ہے۔ ان اسمار کو انکے مطابق کر کے بتاؤ کہ یہ کون ہیں۔ تو وہ

بات جو آدم کو بتائی گئی تھی وہ پوچھی نہیں گئی۔ تاکہ کہا جائے کہ آدمؑ نے

بتا دیا تو کیا کمال کیا۔ اسلئے کہ سکھایا جا چکا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ ملائکہ کو بھی نام بتائے گئے یا نہیں۔ ملائکہ کو نام پہلے

سے معلوم تھے۔ حجاب قدس پر لکھے ہوئے تھے۔ قائمہ عرش پر لکھے ہوئے

تھے۔ ابواب جنان پر لکھے ہوئے تھے۔ یہ نہیں ہوا کہ جن کے نام تھے۔ ان کے

مطابق بھی کر کے دکھا دئے جاتے کہ یہ نام انکے ہیں۔ یہ سوال کرنا کہ خود قرآن

مجید میں یہ کہاں لکھا ہے کہ ملائکہ کو اسمار تعلیم کئے گئے تھے؟ اسکا جواب

یہ ہے کہ قرآن میں یہ بھی تو نہیں۔ لکھا ہے کہ ملائکہ کو نہیں بتائے گئے تھے
یہ امر کہ خدا عادل ہے اور خلاف عدل وانصاف نہیں کرتا براہین عقلیہ
ونقلیہ سے مستقل طور پر ثابت ہے۔ جو کچھ بھی ہم کو اندیشہ کرنا چاہیے وہ
اس سے کہ قرآن مجید میں کوئی ایسی بات لکھی ہوئی نہ ملجائے جو عدل کے
خلاف ہو لیکن ہر بات جو اصلیت وواقعیت رکھتی ہے وہ قرآن مجید میں
ہم کو لکھی ہوئی بھی ملجائے ایسا نہیں ہے۔ دنیا کی بہت سی باتیں ایسی
ہیں، جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ اب اگر آن کو خدا کی طرف نسبت دیکر
ہم سے پوچھیے کہ یہ بات جو خلاف عدل ہے۔ خدا نے کی یا نہیں؟
میں کہوں گا کہ نہیں کی۔ مگر جو چیز قرآن میں موجود ہو اور وہ خلاف
عدل ہو تو وہ چیز ہمارے خلاف حجت ہوسکتی ہے۔

قرآن صرف اتنا کہہ رہا ہے کہ "آدم کو صرف اسماء بتلائے۔ قرآن یہ
کہتا کہ اسماء کے ساتھ آدم کو مسمیات بھی بتائے تو قرآن پر الزام آجاتا۔ اور اگر
یہ کہتا کہ ملائکہ کو اسماء کبھی نہیں بتائے گئے تھے تب بھی الزام عائد ہوتا۔
قرآن نے یہ نہیں کہا۔ بلکہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ آدم کو جو بتلایا گیا تھا وہ ملائکہ
سے نہیں پوچھا گیا لیکن اب وہ اسماء بتائے گئے تھے ملائکہ کو یا نہیں؟
اسکی قرآن میں نہ نفی ہے نہ اثبات ہے۔ جب نہ تو نفی ہے اور نہ اثبات
ہے تو وہ شخص جو عدالت الٰہیہ کا قائل ہے اسکا پابند کیوں ہونے لگا

جس سے عدالت الٰہیہ پر الزام آئے۔

اصل شبہہ جس کے جواب کیلئے ہمکو اتنی پریشانی تھی۔ وہ یہ تھا کہ ہمارے قرآن میں ایسی کوئی بات نہ نکل آئے جو ہمارے عقیدہ کے خلاف ہو۔ یہاں کون کہتا ہے کہ یہ آیت اثبات عدل کے لئے آئی ہے عدل کی دلیل کیا ہے؟ وہ قرآن کی دوسری آیتوں سے ثابت ہو، حدیث سے ثابت ہو، عقل سے ثابت ہو؟ جہاں سے بھی ثابت ہو لیکن یہ میں نے کب کہا کہ اس آیت سے بھی ثابت ہے تاکہ مجھ سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ جزو جس پر عدالت مبنی قرار پاتی ہے اس آیت میں دکھلائیے۔ مجھے تو یہ دکھلانا تھا کہ اس آیت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو عدل کے خلاف ہو اور یہ شکل اس تفسیر کی بنا پر باقی رہتی ہے جو عام طور سے اس آیت کے لئے سمجھی گئی ہے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا عادل ہے حکیم ہے۔ عادل و حکیم نہ سہی۔ مگر ایک معمولی درجہ کے عاقل سے تو کم نہیں ہو سکتا۔ اسمیں تو کسی شخص کو اختلاف نہیں۔

خدا کی جانب سے کوئی ایسی بات عالم وقوع میں نہیں آسکتی جو کم از کم کوئی عاقل نہیں کر سکتا۔ مگر ان تفاسیر کی بنا پر قرآن جو واقعہ پیش کر رہا تھا۔ وہ ایسا ہی ہے کہ ایک ادنیٰ عاقل کی طرف بھی وہ منسوب

نہیں ہو سکتا۔ یہ مشکل مرحلہ تھا جو ہمارے سامنے پیش تھا۔ میں نے ثابت کر دیا کہ قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے۔ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ اس سے الگ ہے۔ آپ اگر علیحدہ سے کوئی چیز شریک کیجئے جو مخالف عدل ہو۔ یا موافق عدل تو یہ اپنے ہاتھ کی بات ہو گی۔

قرآن جو واقعہ پیش کر رہا ہے وہ صرف اتنا کہ اسما بتائے گئے تھے اب یہ جزو علیحدہ رہا کہ ملائکہ کو بھی اسماء معلوم تھے یا نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ملائکہ کو اسما پہلے ہی سے معلوم تھے۔ یہ کیونکر؟ اپنے احادیث کی بنا پر۔ جو خدا کی طرف عدل لازمی قرار دینے کو ننگ و عار سمجھتا ہو میں اُسے پابند نہیں بنانا چاہتا۔ میں اپنے فرقہ کے معتبر روایات اور احادیث کی بنا پر۔ جو خدا کی طرف کسی نقص کو ناگوار سمجھتا ہے یہی کہتا ہوں کہ ملائکہ کو اسماء پہلے ہی سے معلوم تھے۔ یہ اسماء انہی اشخاص کے تھے جو اشخاص پیش کئے گئے۔ جہاں جہاں یہ اسماء تھے وہاں یہ نہیں تھا کہ کون کس کا نام۔ اشخاص پر تطبیق اسماء نہ تھی۔ اسماء سب کو معلوم تھے۔ آدمؑ نے تو عالم وجود میں تازہ قدم رکھا ہے۔ بے خبر ہیں۔ درحقیقت آدمؑ کو بتلانا معیار عدل کو درست کرنا تھا۔ یعنی آدمؑ کے ساتھ ناانصافی ہوتی اگر نہ بتایا جاتا۔ قدرت نے ملائکہ اور آدمؑ کے معیار کو برابر کیا۔ ملائکہ کو جو چیز پہلے سے معلوم تھی اور آدمؑ کو نہ معلوم تھی۔ وہ آدمؑ کو بتا دی گئی۔

تاکہ آدم کے ساتھ نا انصافی نہ ہو۔ جب فیض میں جو اُستاد کی طرف سے پہونچنے والا تھا۔ دونوں شاگرد برابر ہو گئے تو اب ذاتی قوت فراست کا امتحان شروع ہوا۔ کہ اسماء کی تطبیق کریں مسمیات پر۔ یہ سوال پیش ہوا ملائکہ نے شکست کا اعتراف کیا۔ ابھی تک تو میں یہی کہہ رہا تھا کہ قرآن نے اس جزو کا تذکرہ ہی نہیں کیا کہ ملائکہ کو اسماء بتائے گئے تھے۔

لیکن حقیقۃً ایک خفی اشارہ قرآن کے اندر موجود ہے۔ کہ اسماء بتائے گئے تھے۔ ملاحظہ ہو یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک اسماء اور ایک تطبیق اسماء مسمیات پر۔ اسماء دونوں کو بتائے گئے تھے۔ تطبیق اسماء کسی کو نہیں بتائی گئی تھی قرآن میں جو ملائکہ کا جواب درج ہے اُسکے دو انداز ہو سکتے تھے ایک انداز تو یہ ہو سکتا تھا۔ کہ ہم نہیں جانتے یا یہ ہو سکتا ہے کہ کہتے "ہم نہیں بتا سکتے اُسکو جو ہمکو نہیں بتایا گیا" مگر یہاں ترکیب اثبات و نفی کی لائی گئی ہے یعنی ملائکہ نے کہا "ہم نہیں جانتے مگر اتنا جتنا ہمیں بتایا گیا ہے" معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کوئی دو جز تھے۔ ایک جز بتایا گیا تھا۔ اور ایک جز نہیں بتایا گیا تھا اور امتحان اسی جزء کے متعلق تھا جو نہیں بتایا گیا۔ تو ملائکہ نے یہی کہا کہ اگر اتنا ہی پوچھا جاتا۔ جتنا بتایا گیا تھا۔ تو ہم اتنا بتا بھی سکتے تھے۔ یہ جزو وہ تھا کہ جو مشترک تھا آدم اور ملائکہ کے درمیان میں سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا

بالکل وہی ترکیب ہے کہ لا الٰہ الا اللہ نہیں ہے خدا مگر اللہ۔ "الا" سے اثبات اور "لا" سے نفی وہی ترکیب بعینہ یہاں ہے۔ "ہم کو کچھ علم نہیں مگر وہ جو ہمیں بتا دیا گیا ہے" اس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ نے کبھی اپنے جاننے کا اقرار کیا ہے تعلیم دونوں کو ہو گئی۔ اس میں دونوں مشترک ہو گئے لیکن اصل سوال یہ تھا کہ جتنا بتایا گیا ہے اس سے زائد بتاؤ۔ ملائکہ نے اس پر اپنی شکست کا اعتراف کیا۔ اب نظر قدرت متوجہ ہوئی آدمؑ کی طرف۔ تم اے آدم بتاؤ فلما انباءھم باسمائھم قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السموات والارض واعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون۔ جب آدمؑ نے خبر دی ناموں کی تو اب قدرت کو فتح حاصل ہوئی۔ خدا نے ثابت کر دیا کہ امتحان میں آدمؑ ملائکہ سے زیادہ ثابت ہوے۔

ارشاد ہوا "میں نے نہ کہا تھا کہ میں جو تم نہیں جانتے اسکو جانتا ہوں" اس طرح سے ملائکہ کو آدمؑ کے مقابلہ میں شکست کا اعتراف کرنا پڑا۔ آدمؑ کی فضیلت ثابت ہوی۔ تھا یہ کہ معلوم سے مجہول کا پتہ چلانا۔ یہی وہ چیز تھی جس نے آدمؑ کو ملائکہ پر شرف دیدیا۔ یہی وہ چیز ہے جو جوہر کمال ہے انسان کا۔ انسان کی صفت خاص ہے۔ علمی حیثیت سے ترقی۔ اب ایک لفظ میں نے یہ کہا تھا کہ "لامحدود درجہ تک"

یعنی ہر چیز کی ترقی محدود ہے۔ حد طبعی کے اندر۔ میں نے پہلے ہی
عرض کیا تھا کہ خدا نے ہر شے کے اندر ایسی صلاحیتیں قرار دی ہیں کہ
وہ ترقی کرے۔ مگر ہر چیز کے حدود طبعی کے اندر قدرت نے منازل ترقی
قرار دیے ہیں۔ اسکی توضیح کے لئے مثال دی تھی چھ منزلہ مکان کی
اگر انسان کی ترقی بھی محدود ہو تو پھر کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ انسان
اور غیر انسان میں سوائے اسکے کہ ہر چیز ترقی کرتی ہے مگر وہ ترقی
خود اختیاری ترقی نہیں ہوتی۔ انسان کے علاوہ دوسری چیزوں میں
"تکوینی" ترقی ہوتی ہے۔ اور انسان کی ترقی۔ اسکے قوت بازو سے
ہوتی ہے۔ اپنے ارادہ و اختیار سے ہوتی ہے۔ ایک تو یہ فرق ہے۔
انسان اور غیر انسان میں لیکن اسکے علاوہ بھی یہ فرق ہے کہ ان کی
ترقیاں محدود ہیں۔ اسلئے کہ عالم امکان میں سب سے نیچے جمادات ہیں
جن کے آگے نباتات موجود ہیں۔ جماد کی نوع ذاتی۔ قدم آگے بڑھائیگی
تو جماد کا دور ختم ہو جائیگا۔ نباتات کی نوع آجائے گی۔ لہذا ترقی
محدود ہوی۔ اسی طرح نباتات ترقی کریں گے تو محدود ترقی کرینگے
کیونکہ انکے آگے حیوانات کا پہرا بیٹھا ہوا ہے۔ اور حیوانات ترقی کرینگے
تو کہاں تک؟ انکے آگے انسان پہرا جمائے ہوئے ہے۔

معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر چیز کی ترقی محدود ہے لیکن انسان

وہ ہے جو لامحدود ترقی کرنے والا ہے۔ انسان نقطۂ آخر ہے عالم امکان کا کوئی درجہ انسان سے بالاتر نہیں ہے۔ اسلئے انسان کے لئے ترقی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اسکی ترقی کا درجہ کہیں پر جاکر رک نہیں جاتا۔ انسان کے بلند ہونے میں کوئی روک نہیں ہے۔ اسلئے کہ عالم امکان کی آخری سرحد ہے اور خود عالم امکان لامحدود ہے۔ یہ عجیب چیز معلوم ہوگی۔ اسلئے کہ امکان خود محدود ہے۔ لیکن پھر میں کہتا ہوں کہ وہ محدود ہونے کے ساتھ لامحدود ہے۔ عالم امکان کی کوئی حد نہیں ہے اور یہ انسان آخری سرحد ہے عالم امکان کی۔ اسلئے اسکا دائرہ لامحدود حیثیت سے ہونا واضح ہے میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ عالم امکان کے آگے کیا ہے۔ عالم وجوب ہے، وجوب کی صفت کو آپ محدود قرار دے سکتے ہیں؟

اگر وجوب کی صفت محدود ہوجائے تو "امکان" ہوجائے۔ اسلئے کہ معیار "وجوب" لامحدود ہونا ہی اور امکان کا سرا "وجوب سے" ملا ہوا ہے یعنی امکان کے آگے بلندی کے حصہ میں بس وجوب ہی ہے۔ خیال کیا آپنے؟ اور "وجوب" لامحدود ہے۔ جب امکان کا آخری سرا وجوب سے ملا ہوا ہے یعنی امکان کے حدود کا ختم ہوجانا اسکے معنی یہ ہونگے کہ اس پر اگر ایک نمبر اور بڑھا دیا جائے تو وہی وجوب کا درجہ ہے۔ لہذا وجوب بھی محدود ہوگیا۔

معلوم ہوا کہ ادھر امکان محدود ہوا۔ اُدھر وجوب بھی محدود ہوا۔ اب

دوسری لفظوں میں عرض کروں۔ محدود پر جو اضافہ ہوگا تو وہ بھی محدود ہوگا یعنی آپ ۱۰ کروڑ فرض کر لیجیے لیکن پھر بھی قابل اضافہ ہے اور وہ جو اسپر اضافہ ہوا وہ بھی محدود ہی ہے۔ تو اگر امکان کا آخری سرا کوئی ہو تو اُسکے معنی یہ ہونگے کہ وہ وجوب کا پہلا سرا ہے۔ تو پھر جس چیز کا سرا ملجائے وہ محدود ہے یا لا محدود۔

دوسری بات یہ ہے کہ "ممکن" کو جو ملتا ہے وہ واجب سے یا کہیں اور سے ممکن محدود ہو گیا۔ تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ واجب کا فیض محدود ہو گیا اور یہ ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ مختلف درجہ کے الفاظ میں مطلب ادا ہو۔ مگر اختلاف افہام کے مطابق ہو۔ ایک فقیر ہے۔ اُسکو جو کچھ ملتا ہے۔ ایک غنی کی سرکار سے ملتا ہے فرض کیجیے کہ اُس غنی کا خزانہ کبھی ختم ہونیوالا نہیں ہے تو کیا میں نہ کہوں گا کہ اس فقیر کا سہارا کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

اب میں نے جو کہا تھا کہ امکان محدود ہے لیکن محدود ہونے کے ساتھ لا محدود اسکے کیا معنی ہیں۔؟ اسکے معنی یہ ہیں کہ جتنا بھی عالم وقوع میں آئے اور ممکن جتنے درجوں کو بھی طے کر لے وہ ہمیشہ محدود ہی ہونگے لیکن پھر بھی لا محدود ہے یعنی اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے۔ کسی درجہ پر ٹھہرتا نہیں ہے جیسے "اعداد" لا محدود ہیں۔ پھر بھی محدود ہیں۔

اس معنی سے کہ جتنے عدد ہونگے وہ محدود ہونگے۔ اگر محدود نہ ہوتے

تو معدود کیونکر ہوتے یعنی شمار میں کیونکر آتے ؟

لیکن آپ اپنے نزدیک بڑے سے بڑا عدد لیجئے ایک دن بھر ہزار ہزار کہے جائیے اور شام کو جو سنکھ کہہ دیجئے۔ تو میں کہوں گا اس پر ایک اور اضافہ کر دیجئے۔ لہذا لا محدود ہوا۔ یعنی ہمیشہ قابل اضافہ ہے۔ یونہی امکان کے مدارج ترقی ہیں۔ جتنا عالم وجود میں آئے گا وہ محدود ہی ہوگا اگر لا محدود ہو تو "واجب الوجود" ہو جائے گا۔ لہذا یہ ہمیشہ محدود ہی ہے لیکن پھر بھی لا محدود ہے یعنی ہمیشہ قابل اضافہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جتنے ممکنات عالم وجود میں آتے ہیں حکمت و قدرت الٰہی کی بنا پر۔ اسلئے مصلحت نظام عالم۔ انتظام دنیا کسی ایک معیار پر ہو نچکر وجود امکانی کا دروازہ بند کر دے۔ یعنی اس سے بڑھکر کوئی وجود عالم وجود میں نہ آئے لیکن خدا کی قدرت ختم ہو گئی ؟ یا امکانی ترقی کی حد امکانی حیثیت سے ختم ہو گئی ؟

یہ غلط ہے۔ اسلئے کہ وہ ہستی جو درحقیقت عالم امکانی کی فرد منتخب تھی۔ عالم امکانی میں جس سے بڑھکر کوئی فرد عالم وجود میں نہیں آئی۔ وہ مرتے مرتے مر گئی۔ لیکن آخر وقت تک زبان پر "رب زدنی علما" جاری رہا۔ عالم وجود میں جناب رسالتمآب سے بڑھکر کوئی ہستی نہیں ہے کہ جس نے قدم رکھا ہو۔ دنیائے وجود اس ہستی پر آکر ختم ہو گئی۔ عالم امکانی

آخری سرحد۔ جنابِ سالتمآبؐ وہ آخری نقطہ تھے مدارج کمال انسانیت کا جس کے بعد انسانیت نے قدم آگے نہیں بڑھایا۔ جسکے بعد پھر ظرف زماں میں وسعت نہ تھی۔ یہ آخری ہستی تھی۔ مگر یہ آخری ہستی بھی آخری وقت تک یہی کہتی رہی۔ خداوندا میرے علم میں اضافہ کر۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ خدا کا خزانہ ختم نہیں ہوتا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم کے فیضِ کرم میں پھر بھی گنجائش تھی اسلئے برابر سوال کرتے تھے اور برابر مانگتے تھے اور اُدھر سے فیوض کی بارش میں اضافہ ہوتا رہتا تھا درجے بلند ہوتے رہتے تھے۔ جو چیز محدود ہو۔ اسمیں اضافہ کہاں ممکن ؟

مگر ہمیشہ طالب رہے۔ ہمیشہ مانگتے رہے۔ اور ہمیشہ درجے بلند ہوتے رہے۔ نہ سمجھو کہ اب بھی درجے ختم ہو گئے۔ بلندی موقوف ہو گئی یہ انسان کے کام پر موقوف ہے۔ انسان کے لئے ایسے ذرائع بھی ہیں کہ اگر اُن پر عمل کرے تو وہ ترقی کرتا رہے۔ اور اسکے درجے بلند ہوتے رہیں من سن سنة حسنة فله اجر من عمل بها الی یوم القیامة جو شخص کوئی اچھی بات قائم کر دے۔ تو جتنے چلنے والے ہونگے اس تحریک پر اُسکا ثواب اُسکے لئے ہوگا قیامت تک"۔ آپ کیوں نہ ایسے کام کیجئے کہ دنیا سے چلے جایئے۔ تب بھی زندہ رہیئے۔ یہ زندگی ختم ہو جائے تب بھی حیات ابدی حاصل رہے۔ جنھوں نے زندگی کے مفاد کو سمجھا تھا

جنھوں نے واقعی زندگی بسر کی تھی۔ اُنھوں نے ایسے کام کیے کہ مرنے کے بعد بھی واقعی وہ مرے نہیں۔ زندہ رہے۔ کیونکہ اصل موت انسان کی ترقیوں کا ختم ہونا ہے۔ وہ جو دنیا میں مفید کام کر جاتے ہیں تو خود چلے جاتے ہیں۔ تب بھی اُنکی ترقی کے درجے ختم نہیں ہوتے۔ ایک معمولی سی مفید بات ایک اچھی سنت کوئی قائم کر دے تو اُسکا ثواب اُسکے نامۂ عمل میں لکھا جاتا ہے۔ برابر۔ تو جس نے بنائے سنن جاری کی ہو جس نے مذہب کی تبلیغ کی ہو۔ جس نے اسلام کو قائم کیا ہو۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اُسکی ترقیاں۔ دنیاوی زندگی کے ختم ہونے پر ختم ہو گئیں؟ ہر وقت اُنکے مدارج ترقی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ خود انھوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اُسکی بنا پر اُنکی سیرت پر عمل کرنے سے (جتنے افراد عمل کریں سب انہی کے فیض کا نتیجہ ہے) خدا کے فیوض اُنکی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ اور پھر اُنکے احسانات کا یہ نتیجہ تھا اور اُنکی عملی زندگی کا یہ ثمرہ تھا کہ قدرت نے دوسروں کو مامور کیا کہ تم ایسے ذرائع اختیار کرو۔ جس کی وجہ سے اُنکی ترقی اور بھی ہوتی رہے یہ درحقیقت کیا تھا۔ کہ ہر مسلمان پر فرض عائد کیا کہ جب رسولؐ کا ذکر آئے تو صلوٰۃ بھیجو۔ ورفعنالک ذکرک ط تمھارے ذکر کو ہم نے بلند کیا۔ ذکر کا بلند کیا جانا یہی ہے۔

یہ انسان کی زندگی ہے۔ لامحدود۔ علمی وعملی حیثیت سے ترقی کرنا لامحدود درجہ تک۔ یہی وہ ہے جو انسانی زندگی کا مفاد ہے۔ اب انسان کی زندگی کیا ہوئی؟ اُسکی ترقی کے دروازوں کا کھلا رہنا۔ انسان کی موت کیا ہوئی۔ اُن ترقیوں کے دروازوں کا مسدود ہو جانا۔ آپ اگر دیکھینگے کہ دنیا میں کونسا آئین زندگی ایسا ہے جو انسان کی زندگی کے لئے مفید سمجھا جا سکتا ہو۔

جس قانون نے اور جس مذہب نے انسان کی علمی وعملی ترقی کے لئے راہیں صاف کی ہوں جس نے انسان کو علمی وعملی ترقیوں کے راستے بتائے ہوں وہی انسان کی زندگی کا صحیح رہنما ہو سکتا ہے۔ اور جس مذہب نے انسان کی علمی وعملی ترقیوں پر پہرے بٹھائے ہوں۔ سدراہ قائم کئے ہوں اُس کو آپ سمجھ لیجیے کہ وہ مذہب۔ آئین اور قانون ناکارہ ہے۔ اس معیار پر اب اسلام کو لائیے دوسرے تمام دنیا کے مذاہب کے مقابلہ میں۔

اور دیکھیے کہ اسلام نے کہاں تک علمی وعملی ترقیوں کے سبق دئے ہیں راستے صاف کئے ہیں۔ اور دوسروں نے کس طرح انسان کو جکڑا ہے ترقیوں کو روکا ہے۔ اس معیار پر آپ کو ماننا پڑے گا کہ اسلام صحیح مذہب ہے۔

مذاہب عالم

اور

انسانی ترقی

ہم جسوقت دنیا کے مذاہب کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ
دنیا میں بہت سے مذاہب نے علمی و عملی ترقی کے راستے بجائے صاف کرنیکے
اُن پر پہرے بٹھا دئے ہیں۔ اور روکا ہے اسکے بیان کے لئے میرے
بیان کے دو شعبے ہوجاتے ہیں۔ ایک علمی حیثیت سے انسان کی ترقی۔ اور
ایک عملی حیثیت سے انسان کی ترقی۔ ابتک دونوں مخلوط تھے۔ مگر اب
یہاں سے الگ کئے دیتا ہوں۔ اور پہلے علمی ترقی بیان کروں گا
اسکے بعد عملی۔

انسان کی علمی ترقی

اور

مختلف مذاہب کی تعلیمات

علمی ترقی کے لئے قدرت نے انسان میں وہ جوہر ودلیعت کیا جس نے

درحقیقت انسان کو اشرف قرار دیا۔ وہ جوہر تھا معلومات سے مجہولات کا پتہ لگانا۔ لیکن دنیا کے مختلف مذاہب نے کیا کیا؟ یہ کیا کہ عقلوں پر پہرے بٹھائے۔ آنکھوں پر پردے ڈالے غور کرنے کو گناہ قرار دیا۔ انکی تعلیم یہ رہی کہ آنکھ بند کرو اور مان لو۔ آنکھ کھولنا جرم بتایا۔ آنکھ کھولی تو کفر والحاد کا الزام لگایا۔ مذہب کی تعلیم یہ رہی کہ اعتقادات دوسری چیز ہیں اور عقل دوسری چیز ہے۔ یعنی اعتقاد میں عقل کو دخل نہ دو۔ اگر آپ کسی عیسائی کے سامنے جاکر مسئلہ تثلیث کو دریافت کریں کہ ایک ہی چیز بوقت واحد۔ تین بھی ہے۔ اور تین ہوتے ہوئے ایک بھی ہے تو وہ کہے گا یہ راز ہے عقل انسان سے بالاتر۔ اسکی بنیاد بس ایمان پر ہے عقل سے کام نہ لو۔ اگر آپ فدیہ کے رمز کو پوچھئے کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک انسان دوسرے کے گناہ کا بار اپنے اوپر لے لے ایک کے سولی پر چڑھائے جانے کے بعد۔ ہمیشہ کے لئے دوسروں کو مطلق العنان کر دیا جائے۔ وہ کہے گا اسپر ایمان لانا چاہیے یہ عقل سے تعلق نہیں رکھتا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ عقل سے کام لینا جرم قرار دیا گیا۔ مگر جس وقت ہم اسلام کی کتابوں کو دیکھتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام ہمیشہ صاحبان عقل کو مخاطب کرتا ہے۔ اسلام اپنی فتح اسی میں سمجھتا ہے کہ لوگ عقل و غور سے کام لیں۔

ہیں وہ آیات و روایات جو اس سے تعلق رکھتے ہیں بیان کروں گا کہ کس کس طرح اسلام نے عقل کو دعوت دی ہے۔ علمی ذرایع مہیا کئے ہیں لیکن ابھی یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی مذہب اور اہل مذہب کی ذہنیت۔ اسکے روایات ہی سے ثابت ہوتی ہے۔

میں آپکے سامنے توریت کی عبارت پڑھتا ہوں۔ اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح انسان کیلئے عقل سے کام لینے کو روکا گیا ہے۔ اسکے بعد اسلام کی تعلیم مختصر لفظوں میں پیش کروں گا۔ یہ توریت ہے اس کو یہود اپنی خاص مقدس کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ توریت پر بحیثیت مسلمان ہونے کے میرا ایمان نہیں ہے مگر اس کتاب پر یقیناً میرا ایمان نہیں ہے۔ یہ عہد قدیم کے نام سے موسوم ہے جس کے لاکھوں کروروں نسخے ہر سال دنیا میں شایع ہوتے ہیں۔ جو ہزاروں زبانوں میں ترجمہ ہو چکی جس پر سلطنتوں کی طاقتیں صرف ہو رہی ہیں۔ یہ ہماری بے حسی ہے کہ ہم اپنے قرآن کو جو خزانہ ہے معلومات کا پردہ میں چھپائے ہوئے ہیں۔ اور دنیا اس کتاب کو جس سے وہ سادہ لوح افراد کو گوسفندان عیسیٰ کی جماعت میں داخل کرتی ہے اس طرح دنیا میں پھیلا رہی ہے۔ وہ اُن کا احساس ہے اور یہ ہماری بے حسی۔

حضرت آدمؑ اور اُن کا قصّہ

ملاحظہ ہو توریت سفر پیدائش ب ۲ -

"خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اُس نے بنایا تھا وہاں رکھا اور خداوند خدا نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوشنما اور کھانے کے لئے اچھا تھا زمین سے اُگایا اور باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی لگایا۔ اور خداوند خدا نے آدم کو لیکر باغ عدن میں رکھا کہ اُس کی باغبانی اور نگہبانی کرے اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا کیونکہ جس روز تو نے اُس میں سے کھایا تو مرا۔

ب ۳ اور سانپ کل دشتی جانوروں سے جن کو خداوند خدا نے بنایا تھا چالاک تھا اور اُس نے عورت سے کہا کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا؟ عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل تو ہم کھاتے ہیں پر جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اُسکے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ تو اُسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مر جاؤ گے۔ تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اُسے کھاؤ گے تمھاری

آنکھیں کھل جائینگی اور تم خدا کے مانند نیک و بد کو جاننے والے بن جاؤ گے عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لئے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لئے خوب ہے۔ تو اُس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اُس نے کھایا۔ تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور اُن کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور اُنھوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لئے لنگیاں بنائیں اور اُنھوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سنی اور آدم اور اُس کی بیوی نے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اُس سے کہا کہ تو کہاں ہے؟ اُس نے کہا میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور میں ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپایا۔ اُس نے کہا تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے؟ کیا تو نے اُس درخت کا پھل کھایا جسکی بابت میں نے تجھکو حکم دیا تھا کہ اُسے نہ کھانا؟ آدم نے کہا کہ جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اُس نے مجھے اُس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا۔ تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ عورت نے کہا کہ سانپ نے مجھکو بہکایا تو میں نے کھایا۔ اور خداوند خدا نے کہا دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی

کچھ لیکر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے اسلئے خداوند خدا نے اس کو باغ عدن سے باہر کر دیا"

یہ ہے توریت اس سے سبق یہی حاصل ہوتا ہے کہ نیک و بد کی پہچان بری چیز ہے عقل کا صرف کرنا معصیت ہے یہی چیز وہ تھی جس نے آدم کو جنت سے نکالا۔

اسکے برخلاف اسلام نے کیا تعلیم پیش کی۔ جو میں پیش کر چکا ہوں کہ جب انسان کا ملک سے مقابلہ پڑا تو یہی صفت علم ایسی تھی جس نے ملائکہ پر فتحیاب کر دیا جنت سے نکلنے کے واقعہ کو قرآن نے بھی بیان کیا۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے ہمارے روایات میں یہ ہے کہ وہ درخت گیہوں کا تھا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ جو چیز منع کی گئی درحقیقت وہ چیز ہے جو انسانیت کی روحانیت سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ مادیت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس سے جو سبق حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ مادی خواہشوں میں زیادہ منہمک نہ ہو۔ دیکھیا علم، علم وہ چیز ہے کہ ملائکہ پر جس سے شرف حاصل ہو سکا۔

علمی ترقی اور اسلام کی تعلیمات

یہ تعلیم کہ انسان کو علم حاصل کرنا اور عقل سے کام لینا حرام ہے۔ بالکل فطرت کے خلاف ہے حضرت احدیت نے انسان کو جوہر عقل عطا کیا اور اس جوہر عقل کے ذریعہ سے انسان کے لئے علمی ترقی کے راستوں کو کھولا۔

اگر انسان کا آنکھیں بند کئے رہنا قدرت کے نزدیک مناسب ہوتا تو اوسکو آنکھیں دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

قدرت نے تو جو چیز دی ہے وہ کام لینے کے لئے دی ہے۔ اگر اس پر پابندی عائد کی جائے ایسی کہ وہ معطل ہو جائے تو وہ شے بیکار اور عبث ہو جاتی ہے۔ آپ کو آنکھیں عطا کی گئیں ہیں اگر آنکھوں کے بند رکھنے کا حکم دیا جائے کہ وہ آنکھیں کور ہو جائیں۔ تو پھر آنکھیں دینے کا کیا نتیجہ تھا! قوت سامعہ عطا کی۔ لیکن اگر حکم ہوتا کہ اس کو بند کئے رہو تو کچھ دن میں وہ قوت فنا ہو جاتی۔ اس لئے کہ جس قوت سے کام نہ لیا جائے وہ قوت انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ وہ لوگ کہ جو کسی وجہ سے کچھ دن تک صاحب فراش رہے ہوں۔ تمام دن جگہ سے اُٹھتے نہ ہوں اور پابند بستر ہو جائیں تو اگر اون میں جسمانی قوت آ بھی جائے تب بھی کچھ دن تک ساتھ نہیں دیتی۔ ہوتا کیا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ قوت کے ایک عرصہ تک معطل رہنے سے طاقت عمل کمزور پڑ جاتی ہے۔ ایک تاریک تہ خانہ اس میں آپ ایک طویل مدت تک رہیے کوئی چیز نہ دکھائی دے۔ سوائے تاریکی کے نظر کچھ کام نہ دے اُسکے بعد آپ آئیے روشنی میں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ روشنی آپ کیلئے اندھیرے سے بڑھکر ہے۔ اتنے وقت تک نظر کے معطل رہنے نے

بیکاری سے الفت پیدا کر دی۔ اب اگر آپ روشنی میں آتے ہیں۔
یعنی اگر میدان عمل ملتا بھی ہے تو نظر کام کرنے سے انکار کرتی ہے
آپ کسی دن معمول سے زیادہ سو رہیئے۔ اتفاق سے نماز صبح کے وقت تک
آنکھ نہ کھلے۔ جب آپ آنکھیں کھولے گا۔ تو آپ کو دیر تک آنکھیں
ملنے کی ضرورت ہوگی۔ شب میں آنکھیں معطل رہیں کام نہیں کیا۔
اب کھلی بھی ہیں تو کام نہیں کرتیں۔ یہ عارضی التوا کی وجہ سے
ہوتا ہے۔ اسلئے عارضی بیکاری پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اتنی
مدت گذر جائے کہ قوت بالکل مصروف عمل ہی نہ ہو اور کام کرنا اُسے
یاد ہی نہ رہے۔ تو یقیناً وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائیگی
اور کسی صورت سے کام کرنے کے قابل نہ بن سکے گی۔

قوت عاقلہ حضرت احدیت نے غور کرنے کے لئے دی ہے۔
اگر اُسے سوچنے سمجھنے کا حق دینا نہ ہوتا تو وہ سوچنے کی طاقت
انسان میں پیدا ہی نہیں کرتا

اس لئے جبکہ تمام افراد حیوانی کے اندر انسان کو اس صفت
خاص کا مالک بنایا تو اس کا کمال نوعی یہی قرار پانا چاہیئے کہ وہ
اس قوت سے بیش از بیش کام لے اور اُس کو معطل و بیکار
نہ بنائے۔

دوسرے مذاہب عقل کی کارگذاری اور قوت عاقلہ کے صرف و
استعمال سے گھبراتے ہیں اسلئے کہ وہ خطرہ کا احساس رکھتے ہیں۔
اُن کا عقلی قوتوں پر پہرے بٹھانا خود بتلاتا ہے کہ وہ عقل کو اپنا
دشمن سمجھتے ہیں اور اس لئے اس حریف کی قوت توڑنا اپنا فرض
جانتے ہیں۔
ایسے مذاہب ماننے کے قابل کہاں تک ہیں جو عقل ہی کے ساتھ
دشمنی رکھتے ہوں یہ ارباب عقل کے سمجھنے کی چیز ہے بشرطیکہ غور کرنے کا موقع
ملے۔ اسلام دنیا میں اسباب کا دعویدار ہوکر آیا کہ وہ عقل و فطرت کا مذہب ہے
اُس نے عقل کو خاموش نہیں کیا بلکہ اور بیدار بنایا۔ وہ پکارتا ہے
تو صاحبان عقل کو۔ انصاف کا طالب ہے تو اہل عقل سے۔
مجنون دیوانہ اور بالکل ناقص العقل کو تو اُس نے اپنے تکالیف ہی
سے مستثنیٰ کر دیا اور مرفوع القلم بنا دیا۔
وہ زمانہ جب زیادہ تر قوائے عقلی ناقص ہوتے ہیں یعنی بچپنے کا دور
اُسکو اُس نے اپنی پابندیوں سے علیحدہ رکھا۔
بلوغ کا وقت جو قوائے عقلی کے کسی مکمل ہونے کا زمانہ ہے اُسوقت
سے اُس نے اپنا پہلا پیغام پہونچایا اور تکالیف متوجہ کیے۔
وہ قرآنی تعلیمات کو رہنما بتلاتا ہے مگر کس کا؟ صاحبان عقل کا

ان فی ھٰذہٖ تبصرۃ وذکریٰ لاولی الالباب۔

"اس میں آنکھیں کھولنے اور یاد آوری پیدا کرنے کا سرمایہ ہے صاحبان عقل کے لئے" کہیں ارشاد ہوتا ہے۔

لیدّبّروا اٰیاتہ ولیتذکّر اولوالالباب۔

"یہ قرآن نازل کیا گیا اس لئے کہ لوگ اس کی آیتوں میں غور و تدبر سے کام لیں اور صاحبان عقل کی یاد آوری ہو"۔

کہیں ارشاد ہوا۔ ان فی ھٰذا العبرۃ لاولی الالباب۔

"اسمیں عبرت حاصل ہونیکا ذریعہ ہے صاحبان عقل کے لئے"۔

کہیں لعلھم یعقلون لعلھم یذکرون وغیرہ الفاظ سے تعقل و تذکّر کے مقصد کو آرزو اور تمنا کی صورت میں پیش کیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اُسے حسرت ہے۔ اُسے آرزو ہے تمنا ہے کہ لوگ عقل سے کام لیں غور و فکر کی طاقت کو صرف کریں اور سوچکر سمجھنے کی کوشش کریں۔ اُس کے اصول کی کامیابی اسی میں ہے وہ اپنی فتح اسی میں مضمر سمجھتا ہے۔ کہیں وہ آواز دے کر پکارتا ہے اور ارشاد کرتا ہے "یا اولی الالباب" "اے عقل رکھنے والو"۔ معلوم ہوتا ہے صرف عقل کو صدا دے رہا ہے۔ یہی تو اُسکی بات مانیگی اور اُسکے کہنے کی تصدیق کرے گی۔ وہ مذمت کرتا ہے اون لوگوں کی جو آنکھوں سے کام نہیں لیتے ارشاد ہوتا ہے افلا یتدبّرون القراٰن ام علیٰ قلوبٍ اقفالھا

یہ لوگ آخر قرآن میں غور و فکر سے کام کیوں نہیں لیتے ؟ کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں ؟ اُدھر توریت کی وہ تعلیم کہ نیک و بد کی تمیز حاصل کی عقل و شعور سے کام لیا اور بس مر گئے۔ ادھر قرآن کی یہ تہدید کہ " آخر تم غور و فکر کرتے کیوں نہیں " اسکے بعد جو لوگ غور و فکر اور عقل و شعور سے کام نہیں لیتے اُنکے لئے ارشاد فرمایا ہے۔ اولئك كالانعام بل هم اضل سبيلا ۔ " درحقیقت یہ لوگ صورتاً انسان ہیں مگر چوپایوں سے بدتر ہیں "۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم اذان لا يسمعون بها ولهم اعين لا يبصرون بها ۔

" انکے دل تو ہیں سینوں میں مگر قوت عاقلہ سے کام نہیں لیتے۔ انکے کان تو ہیں مگر قوت سامعہ سے کام نہیں لیتے۔ اُنکے آنکھیں تو ہیں مگر دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے "۔

یہ تمام چیزیں عطا کی گئیں ہیں کام لینے کے لئے لیکن انسان نے اوہام کے پردوں سے عقل کو چھپا دیا۔ انسان نے تعصب تنگ نظری اور تقلید کورانہ کے ذریعہ سے عقل کے کمالات کو مردہ کردیا۔ درحقیقت انسان دنیا میں آیا ہے عقل انسانی کو معیار کمال پر پہونچانے کے لئے عقل انسانی کو اُسکے صحیح درجۂ ترقی پر لانے کے لئے۔ اُس نے یہ

ارشاد کیاکہ۔ انھا لاتعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور "در حقیقت وہ نابینا ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ کیونکہ ظاہری آنکھوں کا کور ہونا۔ حقیقتاً کور ہونا نہیں ہے۔ بلکہ کور ہونا جو ہے۔ وہ دل کی آنکھوں کا کور ہونا ہے"

وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے اس کا صحیح صرف نہیں کرتے انکے متعلق ارشاد ہے کہ وہ لوگ روز قیامت نابینا محشور ہونگے ونحشرہ یوم القیامۃ اعمیٰ "میں ایسے شخص کو روز قیامت اندھا محشور کروں گا۔

قال رب لم حشرتنی اعمیٰ وقد کنت بصیرا۔ انسان یہ کہے گا کہ کیوں مجھ کو نابینا محشور کیا گیا۔ حالانکہ دنیا میں میں آنکھیں رکھتا تھا تو ارشاد ہوگا کہ "کذلک اتتک ایاتنا فنسیتہا وکذلک الیوم تنسیٰ" ظاہری آنکھیں تمہاری تھیں تو۔ مگر جب تم ہماری قدرت کی نشانیاں دیکھتے تھے تو ان کو بھلاوے میں ڈالدیتے تھے۔ آج تم بھلاوے میں ڈالنے کے لائق ہو"

وہ لوگ جو اپنی گذشتہ رسموں کے پابند ہو گئے تھے۔ اور اپنے آباؤ اجداد کی سنت پر اس طرح سے عامل تھے کہ انکے پاس کوئی دلیل اسکے سوا نہ تھی کہ ہمنے اپنے آباؤ اجداد کو جس راستے پر دیکھا ہے

اُسی راستے پر جا رہے ہیں۔ اُن کو قرآن نے سخت الفاظ میں تہدید کی قالوا انا وجدنا آبائنا علی امّۃ وانا علی آثارھم مقتدون
" وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو جس مسلک پر دیکھا۔ ہم بھی اُسی پر چلے جائینگے "۔
ایک جگہ۔ نتّبع ما الفینا علیہ آبائنا " ہم بس اُسی کا اتباع کریں گے جس پر اپنے باپ دادا کو چلتے دیکھا ہے "
قدرت نے اسکے جواب میں ارشاد فرمایا ہے قل اولو کان آباؤکم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون " تم اپنے باپ دادا کے راستے پر چلے جاؤگے چاہے تمھارے باپ دادا خود صحیح راستے پر نہ رہے ہوں اور چاہے اُنھوں نے کچھ عقل سے کام بھی نہ لیا ہو "
درحقیقت انسان کی انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ وہ عقل وغور سے کام لے۔ اور صحیح راستے کی شناخت کرے۔ یہ نہیں کہ ہمارے باپ دادا اس راستے پر تھے۔ اسلئے ہم بھی ہیں۔ باپ دادا کا اتباع و پیروی کوئی چیز نہیں ہے۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ اپنے ذاتی کانوں سے آنکھوں سے اور عقل سے راستہ معین کرے۔ اس طرح سے اسلام نے علمی ترقی کے راستوں کو کھولا۔ انسان کی علمی ترقی کی رہنمائی کی۔ اور وہ کہ جنھوں نے انسان پر پابندی عائد کی تھی۔ اور کہتے تھے

کہ عقل سے کام نہ لو۔ جو کہتے تھے ایمان اور چیز ہے۔ اور عقل اور چیز ہے۔ عقل کو دخل دینا گناہ ہے۔ اگر توحید فی التثلیث ہے تو اس پر ایمان لاؤ جاننے کی کوشش نہ کرو۔ اگر فدیہ مسیح ہے۔ تو ایمان لاؤ جاننے کی کوشش نہ کرو۔ وہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے عقل کو مسدود کرنا چاہا تھا جنہوں نے عقل کو کور بنانا چاہا تھا۔ اسلام نے یہ تعلیم دی۔ کہ کسی کا قول مذہب کے بارے میں قابل تسلیم نہیں ہے یعنی اصول عقائد اسلئے ماننے کے قابل نہیں ہیں کہ فلاں شخص نے انھیں کہا ہے۔ بلکہ اصول عقائد تمام تر عقل پر مبنی ہیں۔ انسان اپنی عقل سے غور کرے۔ اور صحیح راستے کو معین کرے۔ جنھوں نے کہا کہ عقل انسان کو فنا کے درجہ تک پہونچا دے گی۔ انھوں نے انسان کو عقل سے کام لینے سے روک دیا۔ جب نسلیں گذر گئیں تو عقل بھی معطل ہو گئی۔ اور عقل کی قوتیں بھی زائل ہو گئیں۔ اب عقل غور و فکر کرنے پر تیار بھی نہیں ہوتی۔ قرآن مجید نے ابتدا ہی سے چھوٹی چھوٹی مثالیں دے کر عقل انسانی کو سمجھایا ہے۔ قرآن شریف کو کیا ضرورت تھی کہ ادلہ و براہین پیش کرے۔ اسکے لئے کافی تھا۔ یہ کہہ دینا "مان لو کہ خدا ہے" اسکے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر اس نے اصول مذہب کو بتایا۔ تو دلائل کے ساتھ ہر قسم کے معیار طبع کے موافق۔ کہیں پر خفی۔ کہیں پر ظاہر۔ کہیں پر سطحی۔

مختلف افکار مختلف عقول کے معیار کے مطابق دلائل پیش کئے۔ تاکہ ہر شخص اپنی عقل سے غور کرے۔

اُس نے یہ ارشاد کیا۔ قل انظروا ماذا فی السمٰوات والارض یہ نہیں کہا کہ "تم مان لو" یہ نہیں کہا کہ "تم تسلیم کر لو" اور بس! بلکہ ان سے کہا "تم غور کرو کہ آسمان اور زمین میں کیا کیا حکمتیں اور نشانیاں مضمر ہیں"۔

ارشاد ہوا۔:

ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف الیل والنھار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیی بہ الارض بعد موتھا وبث فیھا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السمٰوات والارض لآیات لقوم یعقلون۔

"آسمان و زمین کی خلقت میں شب و روز کی آمد و رفت میں۔ اُن کشتیوں میں جو سطح آب پر انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے چلتی رہتی ہیں۔ اور وہ کہ جسے خدا آسمان سے نازل کرتا رہتا ہے۔ آب باراں اُسکے ذریعہ سے زمین کو زندہ کرتا ہے۔ اُسکے مرنے کے بعد۔ اور انہیں جو اُس نے زمین میں پھیلا دئے ہیں حیوانات۔ اور ہوا کے انقلابات میں اور اُس ابر میں جو خدا کے اختیار میں ہے نشانیاں ہیں اُس قوم کیلئے

جو عقل سے کام لے!" درحقیقت اُس نے دعوت دی۔ اپنی عقل سے کام لینے کی۔ کہ دیکھو! اپنی عقل سے کام لو۔ اور سمجھو کہ یہ حقائق قابل تسلیم ہیں یا نہیں۔ یہ معارف و معلومات اس قابل ہیں کہ تم اُن کو تسلیم کرو یا نہیں۔ اُس نے اپنے رسول۔ اپنی کتاب بلکہ خود اپنے وجود جیسی چیز کے اعتقاد کی بھی دعوت دی درحقیقت غور و خوض کے بعد۔ یہی توحید کا مسئلہ تھا۔ اسکو اتنا روشن بنایا۔ ارشاد ہوا" ادھر اُدھر جانے کی ضرورت نہیں جدھر نظر اُٹھا کر دیکھو ہماری نشانیاں ہی نظر آئینگی۔ جو چیز انسان کی نظر کے سامنے آئے اُسمیں خدا کی نشانیاں اسکو دکھلائی دینگی۔ فرض کیجیے کہ کسی کی نظر کبھی آسمان پر نہیں پڑی۔ زمین پر نظر نہیں پڑی۔ کبھی نباتات کو نہیں دیکھا۔ کبھی دریا کی روانی نہیں دیکھی مگر خود تو اپنے پاس ہے۔ خود تو کبھی اپنے سے جدا نہیں ہوا۔ کسی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے نفس پر نگاہ کرلے۔ اگر غور کرے۔ ہمارے وجود سے اپنی ہستی کو معمور پائے گا۔ لیکن غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی ہوتی ہے اور ممکن ہے اکثر افکار و عقول میں تشویش پیدا کرے۔ وہ یہ ہے کہ آخر دنیا والے جنہوں نے خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ کیا وہ عقل کے مالک نہ تھے؟ کیا وہ عقل نہیں رکھتے تھے؟ جنھوں نے ہوائی جہاز بنا دیے

ریلیں بنادیں۔ طرح طرح کے آلات ایجاد کئے۔ یہ لوگ کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ میں عرض کروں گا کہ ابھی میں کہہ چکا کہ ہر چیز میں کام لینے سے طاقت پیدا ہوتی ہے اور بغیر کام لئے ہوئے اُس میں طاقت نہیں پیدا ہوتی۔ اور جس چیز سے آپ کام لیں گے۔ اُسی خاص شعبہ میں اُسے طاقت حاصل ہوگی جس میں کام لیا گیا ہے۔ میں نے اکثر یہ مثال دی ہے کہ اُنگلیاں یہ ایک مختصر سا جز جسم انسانی کا ہیں۔ ظاہر ہیں یا کمزور ہونگی یا طاقت دار۔ مگر یہ تو ہو نہیں سکتا کہ بوقت واحد کمزور بھی ہوں اور طاقت دار بھی ہوں۔ یہ میری انگلیاں ہیں اگر ان میں آپ کسی دن سوئی دیدیں۔ سوئی میں بھی انہی انگلیوں کا کام ہے۔ اور انہی کی طاقت کی ضرورت ہے۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ چند ہی منٹ سینے کے بعد انگلیوں میں درد پیدا ہوجائیگا اب میں آپ سے پوچھوں کہ میری انگلیاں طاقت دار ہیں یا کمزور۔ معلوم ہوگا کہ کمزور ہیں۔ لیکن کسی دن قلم دیدیجئے میری انگلیوں میں صبح سے شام تک میرے سامنے کاغذ رہے۔ اور میں لکھتا رہوں اُنہیں بھی سینہ، بازو اور پیروں کی طاقت کی ضرورت نہیں ہے یہ کام بھی انگلیوں ہی کا ہے۔ یہاں اب انگلیاں کمزور ثابت ہوئیں یا طاقت دار۔ انگلیاں تو طاقت دار ثابت ہوئیں۔ یہ کیا ہے کہ وہی

انگلیاں بوقت واحد طاقت دار بھی ثابت ہوئیں اور کمزور بھی بے شک طاقت دار بھی ہیں۔ اور کمزور بھی یعنی اُس شعبہ میں جس میں کام کیا ہے طاقت دار ہیں مگر اُس شعبہ میں جسمیں کبھی کام نہیں کیا کمزور ہیں۔ بس یوں ہی سمجھ لیجئے عقل کے بھی دو شعبے ہیں۔ ایک مادیت کا ایک روحانیت کا۔ عقل نے مادیت میں کام کیا بڑی ترقی کرتی چلی گئی۔ روحانیت میں کام نہیں کیا اسلئے اس شعبہ میں ایک طفل نو مولود کے برابر ہے۔ درحقیقت طاقت ہر چیز کی اُس شعبہ کے اعتبار سے ہوتی ہے جسمیں اُس نے کام کیا ہے دھوکا نہ کھائیے کہ اگر کوئی پہلوان اتنا طاقتور ہے کہ بڑے سے بڑے پہلوان کو مغلوب کرلے۔ تو وہ منبر پر اگر تقریر بھی کرلیگا۔ وہ صرف اپنے ہی شعبہ میں طاقت ور ہے۔ دوسرے شعبہ میں طاقت جسمانی بھی کمزور ثابت ہوگی بہر حال عقل سے غور کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ عقل سے غور کرو حقیقت کو سمجھو۔ یہ غلط ہے کہ اسلام علم کے حاصل کرنے کے خلاف ہے۔ یہ غلط ہے کہ علمی ترقی سے اسلام کو کوئی صدمہ پہونچے گا اور اسلام کا کوئی نقصان ہوگا۔ اگر علم۔ علم ہے اور درحقیقت انکشاف حقائق کا نام ہے۔ تو جتنا علم دنیا میں ترقی کرتا جائیگا دنیا پر حقائق اسلام منکشف ہوتے جائینگے۔ اسلام نے تو اپنی بنیاد قائم کی ہے علم کی ترقی پر۔

درحقیقت اسلام کو کفار کے ایمان کے راستے پر لانے میں جو کچھ بھی شکست ہوئی۔ وہ انکی علمی کمزوری کی وجہ سے اور جتنی فتح ہوئی وہ علم کو کام میں لانے سے۔ وہ جاہل عرب جو اپنے آباواجداد کے طریقہ کے تابع تھے جو غوروفکر سے کام لینا نہیں جانتے تھے جو بات کے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے تھے۔ اُنکے مقابلہ میں اسلام کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اسلئے کہ اسلام علم کا حربہ لیکر آیا تھا۔ اسلام درحقیقت تامل وتدبر کی سلاح سے جنگ کرنے آیا تھا۔ لہذا جن لوگوں نے علم سے کام نہیں لیا۔ وہ یہی کہتے رہے کہ ہم نے اپنے آباواجداد کو جس راستے پر دیکھا ہے اسپر چلے جائینگے۔ اسلام کی کسی بات کو نہ اُنھوں نے سنا نہ عمل کیا لیکن جن لوگوں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ سمجھنے کی کوشش کی بس ایک مرتبہ آنکھیں کھولیں اور حقیقت اسلام جلوہ گر ہو گئی۔ بس ایک شعاع نورِ حقیقی کی تھی جو دل پر پڑی اور وہ اسلام لانے کے لئے کافی تھی۔ اسلام نے اپنی بنیاد قائم کی ہے علم کی ترقی پر۔ لہذا اسلام علمی ترقی سے لرزہ براندام کیوں ہونے لگا۔ اسلام کے لئے تو یہ شگون نیک ہے کہ دنیا میں علمی ترقی ہو۔ جتنی علمی ترقی ہو گی۔ تعصب گھٹتے گا۔ تقلید کرنے کا جذبہ جاتا رہے گا۔ آباواجداد کے مذہب سے نفرت ہوگی۔ دنیا مسلمان ہو گی۔ چاہے زبان سے اپنے تئیں

عیسائی کہے یا مادہ پرست کہے۔ دہریہ کہے۔ مگر عقائد کے اعتبار سے اسلام کے سامنے سر تسلیم خم کریگی یہ ہماری کمزوری ہوگی اگر ہم علمی ترقی کو اسلام کے حقائق کے ساتھ ساتھ نہ ثابت کرسکیں درحقیقت اسلام علم کی ترقی سے نہیں ڈرتا۔ اور اسلام کی یہی حقیقی جذابیت اور کشش ہے کہ وہ خود علم کی بنیادوں پر مبنی ہے۔ اسوقت مسلمان سو رہے ہیں۔ وہ تعلیم و تبلیغ کی طرف متوجہ نہیں ہیں لیکن اسلام خود ہی دوسروں کو اپنے دائرہ میں لا رہا ہے۔ اسلام خود ہی اپنا مبلغ ہے۔ خود اپنا ظاہر کرنے والا ہے۔ خود اپنے محاسن سے دنیا کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ درحقیقت جتنا علم ترقی کریگا۔ دنیا پر حقائق اسلام منکشف ہوتے جائینگے۔ جو چیز براہ راست فرائض میں داخل ہے وہ بے شک انہی چیزوں کا علم ہے جو عقیدہ و احکام مذہبی سے متعلق ہوں۔ لیکن یاد رکھیے کہ دنیا میں جتنے علمی معارف ہیں وہ اگر صحیح طور سے ترقی کریں تو پیش خیمہ قرار پاتے ہیں اسی ایک مقصد کا جو روح و مذہب اسلام ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سائنس الگ چیز ہے۔ جغرافیہ الگ چیز ہے۔ یہ سب چیزیں مذہب سے جداگانہ ہیں لیکن ان علوم سے اگر فائدہ اٹھایا جائے تو درحقیقت یہ تمام چیزیں مختلف راستوں میں لیجاکر پھر ایک نقطۂ حقیقت پر جمع کر دیتی ہیں۔ میں آپ سے پوچھوں کہ اسلام نے

توحید کو کس طرح سے منکشف کیا۔ اسلام نے خدا کے وجود کو آثار قدرت کے ذریعہ سے واضح کیا۔ خدا کے وجود کو سمجھایا مخلوق کے ذریعہ سے ان مخلوقات کے محاسن دکھلائے۔ ان کے رموز و اسرار پیش کئے گئے۔ ان میں جو حکمتیں مضمر ہیں انکے ذریعہ سے بتلایا کہ ان کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے۔ آثار قدرت کے ذریعہ سے عقل کو معرفت حاصل کرائی جس طرح ایک تصنیف کے ذریعہ سے مصنف کی جلالت قدر ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح آثار قدرت کے ذریعہ سے خدا کے علم وقدرت کو ثابت کیا۔ اب بتلایئے کہ اگر کوئی ایک تصنیف ہمارے سامنے پیش ہوئی ہمارا علم محدود ہے۔ اسکے ظاہری پہلو جو تھے صرف اتنا ہی ہم سمجھ سکتے ہیں لیکن اس تصنیف میں جو باریکیاں ہیں ان کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ یقیناً ہم اس تصنیف کی صرف ایک حد تک قدر شناس ضرور قرار پائینگے لیکن جیسی جلالت مصنف کی اس تصنیف کے ذریعہ سے ثابت ہوسکتی ہے۔ وہ ہم نہیں سمجھ سکتے مگر کوئی شخص ایسا ہو جو اس تصنیف کو ایسا پڑھے اور غور کرے کہ اسکی اندرونی باریکیوں کا، اسکے تمام مطالب اور واقعی ترکیب ساخت حسن انتظام مطالب جزئی کے مناسبات کا اندازہ کرلے۔ تو مصنف کی جلالت قدر اسکی نظر میں زیادہ ہوگی یا نہیں یونہی سمجھ لیا جائے کہ

قرآن جسوقت نازل ہوا۔ عرب صحرا کے رہنے والے موجودات عالم کے باریک پہلوؤں سے بالکل بے خبر صرف ظاہری آثار کو دیکھنے والے تھے لیکن قدرت نے اُتنے ہی علم سے اور اُتنے ہی معارف سے جو ظاہری آثار کے متعلق تھے اپنے معرفت کے لئے فائدہ اُٹھایا اور ان آثار کے ذریعہ سے اپنے کمال حکمت سے دنیا کو روشناس کرایا اگر علمی دنیا ترقی کرے۔ اور اشیاء کے رموز و اسرار زیادہ منکشف ہوتے جائیں۔ اُن کے اجزا اُن کی باریکیاں کُھلتی جائیں تو یہ درحقیقت اُنکے خالق کی حکمت کو زیادہ نمایاں کرنیکا باعث ہونگی یعنی ایک وقت ایسا تھا کہ ہم دنیا کے سامنے یہ پیش کرتے تھے کہ دیکھو خدا کی حکمت کو ایک مختصر سے مختصر حیوان یعنی یہ جو ہوا میں اُڑتا پھرتا ہے۔ اور راتوں کو انسان کو اذیّت دیتا ہے۔ یہ ایک معمولی مختصر سی ہستی رکھنے والا حیوان (مچھر) اپنے اس مختصر سے جسم میں وہ تمام عضا جوارح رکھتا ہے جو ہاتھی باوجود اپنی عظمت جسمانی کے اپنے میں رکھتا ہے۔ بلکہ اُسمیں پر پرواز قدرت نے عطا نہیں کئے اسمیں پر پرواز بھی ہیں۔ تو کیا کہنا اُس مصنف کے اقتدار کا جو کبھی اتنے وسیع صفحہ پر انہی نقوش کو بنانے پر قدرت رکھتا ہے۔ اور کبھی اتنی مختصر سی جگہ پر اُس تمام دنیا کو سمیٹ دینے پر قادر ہے یہ مثالیں ہم

پیش کرتے تھے اور خدا کی حکمت و قدرت کو اس طرح سے سمجھاتے تھے دنیا کو۔ قدرت نے اس مسئلہ کو چھوڑا نہیں بلکہ اس نے کہا ان اللہ لا یستحی ان یضرب مثلاً ما بعوضۃ فما فوقھا فاما الذین امنوا فیعلمون انہ الحق من ربھم۔

"خدا کو اس بات میں شرم نہیں آتی کہ وہ اگر مثال کے لئے ضرورت ہو تو مچھر کو مثال میں پیش کرے یا مچھر سے بھی زیادہ چھوٹی چیز۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس میں رموز و حقائق جلوہ گر ہیں" بے شک اس مختصر ذی روح کو دیکھنے سے اسکے خالق کی معرفت حاصل ہوتی ہے لیکن اگر دنیا کی تحقیقات ایک ایسے نقطہ تک پہونچ جائے کہ وہ مچھر سے بھی زیادہ مختصر۔ باریک سے باریک تر مخلوق کا پتہ چلالے جو ذی حیات بھی ہو لیکن آنکھوں سے دکھلائی نہ دیتا ہو۔ پانی کے ایک ایک قطرہ میں جس کی سیکڑوں فردیں موجود ہوں۔ وہ کونسا قلم تھا جس نے اس مختصر ہستی میں وہ سب کچھ ودیعت کر دیا۔ جو ایک جاندار اور ذی حیات کے لئے ضروری ہے۔ تو بتایئے کہ خدا کی حکمت اور زیادہ منکشف ہوئی یا پردۂ خفا میں چلی گئی۔ ایک وقت تھا کہ انسان خود اپنے اندرونی جسم کے آثار کو نہیں جانتا تھا کہ ہمارے کون سے اجزا کس مقصد کے لئے ہیں۔ مگر اب ایک زمانہ وہ آیا ہے کہ انسانی جزا کے تمام خواص و فوائد ظاہر ہو گئے

یہ تمام باتیں جو منکشف ہوئیں تو اُن سے کیا پتہ چلا - یہ پتہ چلا کہ جتنے علوم ہیں - وہ جتنی ترقی کرتے جائیں اُس بنانے والے کی حکمت کی اور بھی زیادہ وضاحت کریں گے جسکی تبلیغ کے لئے قرآن آیا ہے -

یہ چیزیں درحقیقت خدا کے اعتقاد سے الگ کیونکر کرتی ہیں؟

اسکا رمز ایک دوسرا ہے - وہ یہ ہے کہ اگر کسی چیز کو دیکھا جائے - تو انسان کا نقطہ خیال نتیجہ کو بدل دیتا ہے - ایک آئینہ آپ اپنے سامنے لائیے - اپنے چہرہ کے دیکھنے کے لئے - اب آپ اسکو جتنا زیادہ دیکھیے گا - چہرہ کے خط وخال زیادہ نمایاں ہوتے جائینگے - لیکن اسی آئینہ کو اپنی نظر کے سامنے لائیے صرف آئینہ کی ساخت کو دیکھنے کے لئے - اس وقت آپکو اسکا خیال بھی نہ ہوگا کہ آپ اپنے چہرہ کو دیکھیں کیونکہ اسوقت تو دیکھنا یہ منظور ہے کہ آئینہ کیسا بنا ہے - آئینہ کے موجودہ خصوصیات کا دیکھنا مدنظر ہے - اب آپ آئینہ کی ساخت ہی کی تعریف کیجیے گا - اسکے خاص جوہر واضح کیجیے گا - اگر آپکے چہرہ میں کوئی دھبا بھی ہے تو نظر نہیں آئے گا - کھی نظر آئینہ ہی پر اور آئینہ چہرہ کے سامنے بھی تھا لیکن نظر چونکہ چہرہ پر نہ تھی چہرہ نظروں سے اوجھل رہا - حالانکہ نظر اُس پر پڑی ضرور کیونکہ وہ اسکا لازمہ طبعی ہے - مگر التفات نفس نہ ہونے کی وجہ سے ظاہری نظر بیکار رہی - نظر کو بے نتیجہ کر دیا - مقصد جو آئینہ کا تھا بحیثیت

"آئینہ" وہ حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ جسمانی حیثیت کے اعتبار سے مقصد حاصل ہوا۔ یہ ہی صورت ان حقائق قدرت کی ہے۔ کیونکہ ان مصنوعات میں کچھ انکی طبعی اور مادی حیثیت ہے اور کچھ وہ روشنی ہے۔ جو ان سے پڑتی ہے انکے خالق کے وجود پر۔ انسان کی نگاہ آئینہ کے ذاتی حسن و جمال میں ایسا محو ہوئی کہ وہ اسی میں الجھکر رہ گئی۔ تو اب وہ اس حقیقت کو نظر میں نہ لائے گی جو اسمیں مضمر ہے۔ اسی طرح انسان اپنے مادی خواہشات میں ایسا الجھا کہ اس نے اس روشنی کو دیکھا ہی نہیں۔ جو موجودات قدرت میں مضمر ہے اس نے نظر بھی نہیں ڈالی اس جمال حقیقت پر جو ان چیزوں میں دکھلائی دے رہا تھا۔ آپ نے ان چیزوں کو دیکھا اور بہت غور سے دیکھا۔ انکے تمام طبعی خواص پر نظر کر کے دیکھا۔ مگر وہ جمال مخفی رہا۔ جو انمیں مضمر تھا۔ یہی وہ چیز ہے جس کو حکیم امت اسلامیہ۔ باب مدینۃ العلم۔ نبض شناس مزاج انسانی۔ مزاج دان فطرت بشری یعنی امیر المومنین علی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے۔ دنیا کے وصف میں ارشاد فرماتے ہیں۔ من ابصر بہا بصرتہ ومن ابصر الیہا اعمتہ ایک مختصر سا کلام ہے۔ مگر اس میں وہ سب ہے جو میں نے اپنے طویل الذیل بیان میں کہا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ جو شخص اس دنیا پر خاص طور سے نظر ڈالے تو اسے یہ دنیا اندھا کر دے گی۔ مگر جو اس عینک کو لگا کر دیکھے۔ اس دنیا کو ذریعہ

مشاہدہ قرار دے کر دیکھیے تو اُسکی یہ دنیا آنکھیں کھول دیگی۔ اُسکے لئے یہ دنیا بصارت کا باعث ہو گی۔ اسکے معنی یہی ہیں کہ جب آپ دنیا کو مقصد اصلی بنا کر دیکھئے گا تو وہ مقصد حاصل نہ ہو گا۔ جو اسلام کا مقصد ہے لیکن اگر آپ علمی ترقی کیجئے سائنس کو بڑھائیے اسمیں اضافہ کرتے رہیئے۔ مگر شروع سے نگاہ خالق پر رہے۔ تو یاد رکھیئے کہ جتنا جتنا آپ سائنس میں ترقی کرینگے اور سائنس کے میدان میں آگے بڑھیں گے اتنا ہی منزل معرفت آپکے سامنے آتی جائے گی۔ یہ علوم جتنا ترقی کرتے ہیں درحقیقت سرمایہ مہیا کرتے ہیں حقائق اسلام کے منکشف کرنیکا۔ بس فقط اُدھر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ تحقیقات جاری رہے سائنس کے متعلق ترقی جاری ہے، ابھی تو وقتی حیثیت سے بے خدا کے وجود کی طرف سے ہٹا رہی ہے۔ یا کم سے کم اقرار پر آمادہ نہیں کرتی لیکن یہ تمام سائنس کی کتابیں اسکی تحقیقاتیں ایک ذرا نقطہ خیال پلٹنے دیجیئے یہی تمام چیزیں خدا کے ماننے کا ذریعہ بن جائینگی۔ آپ ملاحظہ کیجئے۔ خداوند عالم کی قدرت و حکمت کو ذرا ذرا سی چیزیں دیکھتے ہیں تو آپ کو اضطراب ہوتا ہے کہ اسکا بنانیوالا کون ہے؟ جتنی اسمیں عجیب و غریب صنعتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اُتنا ہی زیادہ آپ طالب ہوتے ہیں۔ کہ اُسکا بنانے والا کون ہے؟ اگرچہ وہ زیادہ حیرت انگیز بھی نہ ہوں لیکن اگر وہ انتہائی حیرت انگیز بھی ہے تو آپ کو بہت زیادہ

اشتیاق پیدا ہوتا ہے موجد کی تلاش کا۔ آپ میدان میں گذرتے ہیں بہت سے ٹیلے آپ کی نظر سے گذرتے ہیں لیکن کسی سے آپ نہیں دریافت کرتے کہ یہ تودہ ریگ کا کس نے بنایا! لیکن اگر اُس جنگل میں جہاں دور دور تک آبادی نہیں ہے۔ آپ کو ایک ساختہ وپرداختہ کنواں نظر آئے تو آپ کہیں گے کہ ایک زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آبادی تھی کیونکہ یہاں کنواں بنا ہوا ہے۔ مگر اسکا بنانے والا کون ہے؟ یا کہینگے کہ خدا اُسکا بھلا کرے جس نے یہاں کنواں بنا دیا۔ یہ کس لئے تلاش ہوئی؟ اسلئے کہ اس تودہ ریگ میں نہ تو کوئی خاص غایت نظر آتی تھی۔ نہ کوئی حکمت مضمر معلوم ہوتی تھی لیکن یہاں کنواں کھدا ہوا ہے زمین میں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی باشعور آدمی نے اس کو یہاں بنایا ہے۔ اسلئے فکر ہوئی۔ اگر نہایت عمدہ عمارت ہوتی تو آپ کہتے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بادشاہ یہاں سے گذرا ہے۔ یہ عمارت اُسکی بنوائی ہوئی ہے۔ لہذا جتنی صنعت زیادہ ہوتی جائیگی اتنی ہی زیادہ انسان کی فطرت اسکے موجد کی طرف انتقال کریگی جسوقت تک دنیا کی تحقیقات محدود تھی اور صنعتیں انسان کیلئے نمایاں نہ ہوئی تھیں۔ اتنی انھیں ندرت بھی زیادہ نہ تھی۔ اب جتنا سائنس زیادہ ترقی کرے گی۔ اُتنے ہی زیادہ حیرت انگیز رموز واسرار

منکشف ہوتے جائینگے لہذا اب تو جذبہ موجد کی تلاش کا اور بھی زیادہ
بڑھتا جائیگا۔ اور اب تلاش حقیقت اور زیادہ آسان ہوتی جائے گی
ایک وقت انسان ظاہری شکل کو دیکھتا تھا حیرت کرتا تھا کہ یہ حکمت
کی باتیں ہیں یہ رموز قدرت ہیں لیکن اب جسوقت ہمیں یہ معلوم ہوا کہ
وہ خالق کتنا باریک نقاش ہے کہ اتنے سے مختصر انگوٹھے میں جسکے
نقش ہماری نظر کے سامنے پورے طور سے دکھلائی بھی نہیں دیتے
مگر کس قدر قادر بنانے والا ہے کہ اس نے اتنی سی جگہ میں ایسے نقوش
بنائے ہیں جو کبھی ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں ہیں۔
یاد رکھئے میں جو آپ سے عرض کرتا ہوں کہ دنیا ایمان لائے ہوئے
ہے اس صنعت اور اسکے استحکام پر۔ اس صنعت کے نا قابل تبدیل
ہونے پر کہ یہ قانون بدلے گا نہیں یعنی ایک غیر مقتدر انسان ایسے
نقوش بناتا ہے جو کبھی ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں کبھی الگ ہو جاتے
ہیں لیکن اگر کسی ایسے قادر کے قائم کیے ہوئے نقوش ہیں جسکا ہاتھ
کبھی دہوکا نہیں کھاتا جسکے قلم میں کبھی لغزش نہیں ہوگی۔ تو اس کے
بنائے ہوئے نقوش پر اور انکے استحکام پر اتنا اعتماد بھی ہوگا کہ مہر
معتبر نہیں۔ دستخط معتبر نہیں کیونکہ بنائی جاسکتی ہے۔ مگر یہ نقوش
معتبر ہیں۔ اسلئے کہ معلوم ہے کہ بس انکا ایک ہی بنانے والا ہے۔

اور کوئی نہیں۔ اور وہ ایسا بنانے والا ہے کہ اسکا قلم کبھی چوکتا نہیں
یہ کب منکشف ہوا؟ یہ اسوقت منکشف ہوا جب علم تشریح نے ترقی
کی۔ یہ اسوقت منکشف ہوا جب سائنس دنیا کے سامنے آئی ہی لئے
میں کہتا ہوں کہ جتنا سائنس ترقی کرتی جائے گی خدا پر ایمان اور
زیادہ ہوتا جائیگا۔

اسلام اور حریت عقل

دنیا کے وہ مذاہب انتہا سے زیادہ کمزور ہیں جنہیں تحقیق کو خطرہ کی
نظر سے دیکھا جاتا ہے جنھوں نے انکے مذہبی عقائد کے سلسلہ میں
پردہ پوشی سے کام لیا ہے انھوں نے اپنے حلقہ بگوشوں کے لئے
جرم قرار دے لیا ہے کہ وہ مذہبی گفتگو کریں۔ یہ کیا ہے؟ انھیں اپنے
مذہب کی اصلی بنیادوں کے کمزور ہونے کا احساس ہی۔ لہذا وہ جانتے
ہیں کہ ادھر گفتگو ہوئی ادھر شیشہ عقائد پر سنگ اعتراضات کی بارش
ہوئی عیسائی مذہب جو آجکل تبلیغ میں مصروف ہی۔ دنیا جانتی ہے کہ
اسکے تمام رہنماؤں کا یہی طرز عمل رہا کہ انکی مذہبی کتابیں دوسروں کے
ہاتھوں تک نہ جانے پائیں۔ چند خاص افراد تھے جنکے پاس مذہبی

کتابیں محدود رکھی جاتی تھیں۔ کسی کو حق نہ تھا کہ وہ مذہبی کتابوں کو دیکھ سکے۔ جب دیکھے ہی گا نہیں تو رائے کیا قائم کریگا۔ لطف یہ ہے کہ آج بابی یا بہائی مذہب جس کے ماننے والے اس کو اپنے تئیں انیسویں بیسویں صدی کا رہنما قرار دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے تعلیمات جدید طرز زمانہ کے مطابق ہیں۔ اسکی مذہبی کتابوں میں بھی یہ حکم موجود ہے کہ

"کور شو تا جمال من بینی، کر شو تا صدائے من لشنوی"

اندھے ہو تو جب ہماری حقیقت کا جلوہ تم کو دکھائی دیگا۔ بہرے ہو تب جاکر ہمارا کلام تم پر اثر کریگا"

ادھر یہ تعلیم ہے۔ مگر اسلام جو تیرہ سو سال سے اپنے واحد ہونیکا اظہار کر رہا ہے وہ اندھوں کی مذمت کرتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے من کان فی ھٰذہٖ اعمیٰ فھو فی الاٰخرۃ اعمیٰ واضل سبیلا۔ وہ اندھے بننے کو نہیں کہتا بلکہ یہ کہتا ہے کہ آنکھوں سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے وہ بہرا ہونے کو نہیں کہتا بلکہ وہ کانوں پر سے پردے ہٹانے کو کہتا ہے وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ انکی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔

درحقیقت اسلام صحیح تعلیم کو ترقی دینا چاہتا ہے اور چاہتا ہے

کہ ہمارے حقائق دنیا کے سامنے منکشف ہوں عقل وہی عقل جس کو
بہت سے لوگوں نے اپنے لیے انتہائے زیادہ خطرناک سمجھ لیا۔ اسکے لیے
معلم الاسلام کا ارشاد ہے من لاعقل لہ لادین لہ "جسکے لیے
عقل نہیں ہے۔ اسکے لیے دین نہیں ہے"۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ
دین کی بنیاد عقل پر قرار دیگئی۔

یہ ارشاد ہوا۔ العقل ما یرضی بہ الرحمٰن ویکتسب بہ الجنان
عقل وہ ہے جس کی وجہ سے خدا خوش ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان باغ
بہشت کا مستحق بنجاتا ہے۔ یہ دنیا کی کوتاہ نظری ہے کہ اس نے عقل
حیلہ بازی کو قرار دے لیا۔ ان معنوں سے اگر عقل کو غلط استعمال
کیجیے تو عقل نہیں ہے یہ شیطنت ہے عقل تو خیر محض ہے عقل تو
خدا کی حجت ہے عقل کو خدا نے اپنی طرف سے سفیر بنایا ہے۔ عقل!
اگر درحقیقت عقل ہو تو وہ معصوم ہے عقل خطا سے منزہ ہے۔ لیکن
جس طرح غلط دعویداران نبوت بھیس بدل کر انسان کو گمراہ کرتے ہیں یوں
اسی طرح قوت واہمہ عقل کا لباس پہنکر انسان کے سامنے آتی ہے۔
عقلا کے اقوال میں اختلاف ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھیے کہ انکے اقوال میں
سے ہر قول مطابق عقل ہی ہوتا ہے عقول اختلاف رکھتے ہیں لیکن
درحقیقت عقل ان میں سے ایک ہی کی موید ہوتی ہے۔ اور ان دوسرے

اقوال سے بیزار ہے ۔ پھر وہ مختلف اقوال میں فیصلہ کرنے والی ہے۔ ایک قیاس یعنی عقلی دلیل کی مُشتبہ شکل میں عقل ہی غلطی کی گرفت کرتی ہے عقل رہنما ہے مگر پردہ میں ہے اسلئے ہر مکار عقل کا لباس پہنکر انسان کے سامنے آتا ہے ۔ اور گمراہ کرتا ہے لیکن عقل اپنے فیوض باطنی سے حیلہ بازی کا پردہ چاک کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ دلیل یہاں سے باطل ہے ۔ اصول مذہب درحقیقت تمام تر عقل پر مبنی ہیں ۔ بتائیے خدا کے وجود پر ایمان کس طرح لائیں؟ قرآن میں دیکھکر کہ خدا ہے ایمان لائیں؟ اگر خدا ہے نہیں تو قرآن کیسا! پھر خدا کے وجود پر اگر ہم ایمان لائیں تو سوائے اسکے کہ عقل کے دامن کو تھامیں اور کس طرح سے ایمان لا سکتے ہیں ۔ رسولؐ کی رسالت پر ایمان لانا چاہتے ہیں تو کیا خود اُنکے ہی کہنے سے اُن پر ایمان لائیں؟

درحقیقت سب سے پہلی تصدیق کرنے والی رسالت کی عقل ہے اگر عقل نہ ہوتی تو انبیا اور رسل کی آوازیں پکارتے پکارتے تھک جاتیں اُنکی صدائیں خاموش جاتیں اور دنیا سننے پر مجبور نہ ہوتی ۔ لیکن عقل ہی وہ چیز ہے جو لاتی ہے دنیا کو رسولؐ کی آواز کی طرف ۔ درحقیقت عقل وہ ہے جو سب کچھ ہے ۔ پھر دنیا کی ہر حقیقت ہمیشہ عقل سے ثابت ہوتی ہے ۔ غلط ہے اُنکا قول جو کہتے ہیں کہ ہم اپنے معلومات کی بنیاد

احساس پر رکھتے ہیں۔ احساس کبھی انسان کو حقانیت اور صداقت تک نہیں پہونچا سکتا جبتک عقل کا قدم درمیان میں نہ ہو۔ میں آپ کو ایک آسان مثال دیکر بتاؤں۔

بجلی کا پنکھا جس وقت تک وہ ساکن ہے۔ اُنہیں تین پر نظر آینگے۔ لیکن جسوقت وہ حرکت کرنے لگے گا۔ تو اب آپ مشاہدہ کیجیے گا۔ وہ ایک واحد طبق دکھائی دیگا۔ اگر صرف احساس پر ہم اپنے عقیدہ کی بنیاد قرار دیں تو سمجھنا پڑے گا کہ شکل میں تبدیلی واقع ہوگئی۔ جو چیز تھی وہ فنا ہوگئی۔ اب دوسری چیز ہوگئی۔ پہلے تین پر تھے اب نہ معلوم کس طرح سے اُن میں اتصال ہوگیا۔ لیکن عقل ہی ہے جو اس راز کو منکشف کرتی ہے۔ کہ اب بھی وہی تین پر ہیں جو پہلے تھے۔ لیکن حرکت کی سرعت کی وجہ سے چونکہ اسکے وجود کا ایک جز خیال سے نہیں مٹنے پاتا کہ دوسرا اُسکی جگہ آجاتا ہے۔ دوسرا نہیں مٹنے پاتا کہ تیسرا اُسکی جگہ آجاتا ہے۔ لہذا وہ سب ایک ہوکر شکل ایک طبق کی پیدا کرتے ہیں مگر ہیں وہی تین پر جو پہلے تھے۔ ہماری نظر کا پھیر ہے کہ ہمکو صرف ایک طبق ہی دکھائی دیتا ہے۔ یہ حقیقت کا انکشاف عقل نے کیا۔

ایک انسان کو آپ ایک بلند منارہ پر سے جاکر دیکھیے تو وہ چھوٹا نظر آئے گا۔ وہاں سے اتر آئیے نیچے کی سطح پر تو اب کچھ بڑا معلوم ہوگا

جب بالکل قریب سے دیکھے گا تو اتنا ہی نظر آئے گا جتنا آپ عام طور سے دیکھا کرتے ہیں۔ اگر ہم صرف نظر ہی پر اپنی بنیاد قرار دیں تو ہم کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ آدمی بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے۔ اُسوقت وہ چھوٹا تھا اب بڑا نظر آتا ہے۔ حقیقتاً اُسمیں یہ انقلاب ہوا؟ لیکن عقل حقیقت کا انکشاف کرتی ہے عقل یہ کہتی ہے کہ نہیں! یہ جتنا تھا اتنا اب بھی ہے لیکن شرائط رویت کی بنا پر مسافت ایک خاص معیار پر اگر ہے تو وہ اُس شے کو اُتنا ہی دکھلائے گی جتنی وہ ہے لیکن اگر مسافت میں کچھ بعد پیدا ہوجائے تو جتنا وہ ہے اُس سے چھوٹا دکھائے گی۔ شے ایک ہی رہتی ہے لیکن نظر کا پھیر ہے جو چھوٹا اور بڑا بناتا ہے۔ یہ کس نے انکشاف حقیقت کیا؟ عقل نے کیا۔ حالانکہ ہماری حس دھوکا کھا رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ جتنے حسیات ہیں اُن میں واقعیت کی شناخت عقل ہی پر ہے۔ لیکن یاد رہے کہ عقل وہیں تک کام کرتی ہے۔ جتنا عقل خود مدعی ہو کام کرنے کی لیکن اگر کسی جگہ عقل خود حکم لگائے کہ یہ میرا شعبہ عمل نہیں ہے عقل خود کہے کہ اسمیں میرا بس نہیں ہے۔ تو وہاں عقل سے کام لینا خود عقل ہی کے فیصلہ کے خلاف ہوگا۔ اسلئے اُس سے کام لینے کے بعد اگر بظاہر آپ کی عقل کسی نتیجہ تک پہونچائے تو وہ نتیجہ بھی عقل کا کچھ صحیح نتیجہ نہ ہوگا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اصولی عقائد بے شک

وہ ہیں جو تنہا عقل ہی کے ذمہ ہیں۔ ان اصولی عقائد اور مذہب کی بنیادوں کو عقل سے دریافت کیجئے لیکن جب آپ اُنکی بنیادوں کو صحیح طریقہ سے مضبوط کر لیجئے تو اس مذہب کے فروع اُسکے قوانین و قواعد اُسکے عملی احکام ان میں یہ ضرور نہیں ہے کہ آپ کی عقل ہر جگہ صحیح نقطہ تک پہونچ جائے۔ یعنی خدا کے وجود کو آپ عقل سے سمجھئے۔ اُسکے صفات ثبوتیہ و سلبیہ سب عقل سے دریافت کیجئے۔ رسولؐ کی رسالت عقل سے دریافت کیجئے لیکن رسول کوئی قانون لے کر آتا ہے کچھ قواعد خدا کی طرف سے عملی تربیت انسان کے لیکر آتا ہے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ عقل کا فیصلہ خود اُسکے فیصلہ کے متضاد ہو جائے۔ عقل نے رسول کی رسالت کو ضروری سمجھا۔ اسلئے کہ انتظام بشری کے لئے۔ نظام اجتماعی کے لئے ضروری ہے کہ ایک قانون اور آئین ایک ایسی ہستی کا بنایا ہوا ہونا چاہیئے جو تمام افراد بشر کی صحیح مزاج داں ہو۔ جو نظام انسانی سے صحیح طور سے باخبر ہو عقل نے یا تو رسول کی ضرورت ہی نہ سمجھی ہوتی تب اُسکے معنی یہ ہوتے کہ اصل محل اختلاف ہے۔ لیکن اگر عقل نے رسولؐ کی ضرورت سمجھ لی تو اُسکے معنی یہ ہیں کہ جزئی قواعد کے لئے صرف عقل انسانی کافی نہیں ہے یہ فیصلہ خود عقل نے کیا۔ اگر ایسا نہیں تو رسولؐ کی ضرورت ہی کیا تھی عقل ہر شخص کے دماغ میں موجود ہی

وہ خود ہی ایک لائحہ عمل بنا سکتی ہے لیکن عقل اس وادی میں آکر عاجز نظر آتی ہے۔ اسلئے کہ عقل ہر شخص کے لئے انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ بیشک اپنے ذاتی حالات سے ہم پورے طور پر مطلع ہیں لیکن عقل انفرادی ہرگز اجتماعی حیثیت سے بصارت و بصیرت نہیں رکھتی یعنی نظام عالم میں جتنے اجزا کر داخل ہیں۔ اُن پر کسی عقل کو عبور حاصل ہو ایسا نہیں ہے۔ قانون تو ایسا ہونا چاہیے جو تمام اجزائے عالم کے مناسبات سے۔ تمام افراد کے معیار طبع خصوصیات شخصی و اجتماعی۔ ہر شخص کے مصالح و حکم کے لحاظ سے مجموعی حیثیت سے جنکا لحاظ ضروری ہو بنا یا گیا ہو کسی انسان کی عقل انسانی تو حدود میں کبھی اسکی دعویدار نہیں ہو سکتی کہ تمام افراد کے خصوصیات جزوی و اجتماعی کی پورے طور سے عالم ہے اور جب وہ پورے طور سے واقف نہیں تو وہ کوئی قانون بھی ایسا نہیں بنا سکتی جو بوقت واحد تمام عالم کے انتظام کے لئے کافی ہو چونکہ عقل حق شناس ہے عقل حقیقتاً معصوم ہے ہمیں نے کہا کہ عقل کبھی غلطی نہیں کرتی لہذا عقل اپنی اس کمزوری کو بھی جانتی ہے۔ وہ اپنے درجہ و منزلت کو سمجھتی ہے۔ اسلئے عقل انسان دنیا کے قانون کی ساخت کے لئے ضرورت سمجھتی ہے معلم قدرت کی کہ وہ اس قانون کو بنائے۔ وہ۔ بیشک۔ تمام افراد انسانی کے انتظام کے لئے کافی ہوگا۔ جب عقل نے اپنی شکست کا اعتراف کرلیا۔ تو پھر اب عقل کو

کیا حق ہے۔ کہ وہ جزئی باتوں میں پوچھے کہ یہ کیوں ہے اور یہ کیوں ہوا؟ یا تو رسول ؐ کی رسالت کی ضرورت ہی نہیں۔

اس مرحلہ کو ضرور طے کر لینا چاہیئے یہ بے شک عقل سے متعلق ہے۔ رسول ؐ کی رسالت کو تسلیم کرنے کے بعد اب عقل کسی شخص خاص کی رسالت کو نہیں تسلیم کرتی۔ وہ کہتی ہے کہ بے شک رسالت ضروری ہے مگر یہ شخص خدا کا فرستادہ نہیں ہے۔ اب آئیے معیار رسالت عقل ہی کے رو سے مقرر کیجئے دیکھئے وہ کیا شناخت قرار دیتی ہے کہ رسول ؐ کی رسالت کون کون باتوں پر مبنی ہے یہ قرآن میں دیکھنے کی چیز نہیں۔ یہ حدیث میں دیکھنے کی چیز نہیں اس کو بے شک عقل سے سمجھئے لیکن جب معیار رسالت عقل کے ذریعہ سے طے ہو جائے تو ہم یہ دیکھیں کہ اس شخص میں یہ امور پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ اگر پائے جاتے ہیں تو عقلاً وہ رسول ہو گا۔ اسلئے کہ اس صورت میں پوری دلیل عقلی ہمارے سامنے پیش ہو جائے گی۔ کہ یہ شخص ایسا ہے جسمیں یہ معیار پایا جاتا ہے لہذا یہ رسول ہی ضرور جب یہ طے ہو گیا عقل نے معیار رسالت بھی بنا لیا اور وہ کسی شخص خاص میں پایا بھی گیا تو اسکے معنی یہ ہوئے کہ وہ خدا کی طرف سے رسول ہے اور اُسکا قانون خدا کی طرف سے ہے۔ اُس نے کہا۔ "مغرب کی تین رکعتیں" ظہر کی چار رکعتیں" اور صبح کی دو رکعتیں" اب عقل کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ کہے کہ یہ کیوں

اور وہ کیوں؟

ایک بادشاہ ہے، اُسکے ارکان حکومت کے لئے عقل یہ ضروری سمجھتی ہے کہ وہ ارکان حکومت جبوقت کہ اُسکے دربار میں جائیں تو آداب دربار پر عمل کریں رسوم دربار کو اپنے پیش نظر رکھیں کسی نے اگر رسم دربار کے خلاف کیا۔ عدول حکمی کی۔ اُسکو سزا دیجائے تو عقل کہے گی کہ بے شک مستحق سزا ہے۔ لیکن آداب و رسوم دربار کیا ہیں؟ خود عقل کہے گی کہ یہ آداب و رسوم دربار قرار داد سے تعلق رکھتے ہیں جو جس دربار میں قرار پا گئے ہوں۔

بے شک جبکہ عقل کے فیصلہ کے مطابق حضرت احدیت حکیم علی الاطلاق ہے اور اُسکا کوئی فعل حکمت و مصلحت کی حد سے باہر نہیں جاتا ہے۔ اسلئے جو حکم وہ دیگا۔ چاہے وہ عبادات سے تعلق رکھتا ہو۔ چاہے معاملات سے تعلق رکھتا ہو۔ اسمیں کوئی نہ کوئی خاص حکمت و مصلحت ضرور مضمر ہوگی۔ ہم وہ نہیں ہیں جو یہ کہیں کہ حکم الٰہی میں کوئی مصلحت نہیں ہوتی اور اگر خدا چاہے تو بری بات کا حکم دیدے وہ اچھی ہو جائے گی حکم کی وجہ سے خدا کو کسی مصلحت پر نظر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہر چیز میں حکم و مصالح ضرور ہیں۔ مگر اسکے معنی یہ ہیں کہ کوئی حکم جو حضرت احدیت کی طرف سے آئے اور ہمارے لئے ثابت ہو جائے تو ہمیں مجمل طور سے

سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حکم ہی نہ ہوتا۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مصلحت ہماری عقل بھی سمجھ لے۔ اسلئے کہ عقلِ مخلوق اور حکمتِ خالق میں بہت بڑا تفرقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری عقل کبھی قاصر بھی رہتی ہے۔ میں نے یہ کہا ہے کہ عقل معصوم ہے یعنی غلط حکم نہیں لگاتی۔ لیکن ہر جگہ حکم بھی لگاتی ہے اور سمجھ بھی لیتی ہے؟ ایسا نہیں ہے جہاں عقل نہیں سمجھتی وہ خود کہہ دیتی ہے کہ میں نہیں سمجھتی۔ جہاں قاصر رہتی ہے کہدیتی ہے کہ میں قاصر ہوں۔ یہ اسکی سچائی ہے اور یہی اُسکی عصمت ہے۔ مگر اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ عقل انسان ہر بات کو سمجھ لیتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو علم ترقی کیونکر کرتا۔ اسکی ترقی یونہی ہوتی ہے کہ بعض باتیں پردہ خفا میں تھیں جو بعد میں ظاہر ہوئیں۔ ایسے ہزارہا رموز تھے جو ایک زمانہ میں افکار عقلی سے مخفی تھے۔ اب علمی ترقی نے اُن اسرار کو منکشف کیا۔ باوجود اسکے کہ دنیا انتہائی مدارج کمال پر علمی حیثیت سے پہونچ گئی ہے۔ مگر ہمارا کمال یہی ہے کہ اب ہم سمجھنے لگے ہیں کہ ہم ابھی کچھ نہیں سمجھے۔ درحقیقت کل اسکا اقرار کرتے ہیں کہ آئندہ جو معلومات منکشف ہونے والے ہیں وہ ایسی ہونگے جن کے مقابلہ میں اس وقت تک کے معلومات ہیچ ہوجائینگے۔ ایک بہت بڑا سمندر کا پاٹ ہمکو طے کرنا باقی ہے۔ اگر زمانہ مستقبل میں حالات مساعد ہوئے تو ممکن ہے کہ

ہم اس سمندر کے وسط تک پہونچ جائیں۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ابتک انسان کی عقل سے پوشیدہ رہی ہیں۔ دنیا کہتی ہے کہ آج ہم سمجھے کہ ابھی تک ہم کچھ نہیں سمجھتے تھے اور وہ جو بتلانے والا تھا اسنے پہلے ہی یہ کہدیا تھا ما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔

یہ علمی ترقی یہ علمی انکشافات جو روز بروز ہوتے رہتے ہیں یہ دلیل ہیں اس بات کی کہ ہم ابھی تک جاہل ہیں۔ ہماری عقلیں نشو ونما کر رہی ہیں مگر نشو ونما تو وہی کرتا ہے جو کامل نہ ہو۔ کمال کے بعد کوئی درجہ ترقی کا نہیں رہتا۔ روز بروز جدید معلومات کا حاصل ہوتے رہنا۔ بتلاتا ہے کہ ہماری عقل ابھی کمسن ہے۔ ہماری عقل ابھی نوخیز ہے۔ ابھی نشو ونما اور بڑھنے کا زمانہ ہے پھر ان نوعمر عقلوں پر ہم اس خدائے حکیم کے احکام کے تمام رموز کو سمجھ لینے کا دعوی کریں جو ازل سے ابد تک ہر چیز پر محیط ہے۔ اسکے علم میں تدریج نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ پہلے نہیں معلوم تھا۔ اب معلوم ہوگیا۔ جب ہمارا علم اتنا محدود ہے تو ہمیں کیا حق ہے کہ تمام اسرار پر نظر کریں یہ یقین کرکے کہ ہم ان کو ضرور سمجھ ہی لیں گے۔ بے شک یہ علم کی ایک خامی ہوگی کہ ہم رموز و اسرار کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ ممانعت نہیں ہے کہ آثار قدرت میں غور کیجئے۔ اسکے احکام میں تامل و تفکر کیجئے ممنوع نہیں ہے۔ لیکن آپ اسکے احکام کے پابند ہونے میں

انتظار کیجئے اُن کی مصلحت کو سمجھ لینے کا۔ تب پابند ہوجیے۔ ایسا نہیں پابندی اسلئے کرنا چاہیئے کہ خدا کا حکم ہے۔ غور کیجئے اسلئے کہ حکم دینے والا حکیم علی الاطلاق ہے اگر ہم اسکی مصلحت کو سمجھ لیں تو ایک علمی ترقی ہے۔ اسلام نے راستے کھول دئے ہیں۔ اسی کی بنا پر احکام کی مصلحت پر غور کیجئے۔ ائمہ معصومین نے علل شرائع بیان کئے ہیں اسی شوق کے پیدا کرنے کے لئے کہ عقل سے احکام کی حکمتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ غور کریں کہ اسمیں کتنی بڑی بڑی حکمتیں مضمر ہیں قرآن مجید میں بہت سے احکام کے ساتھ اُنکے حکم و مصالح بھی بیان کئے ہیں۔ یہ سب اسی لئے ہے کہ ایک طرف آپ عملی حیثیت سے پابند ہوں۔ دوسری طرف علمی ترقی کا دروازہ بھی کھلا رہے یعنی احکام کے مصالح پر غور و فکر اگر کوئی علمی ترقی کے لئے کرنا چاہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

ہمارے بہت سے روشن خیال حضرات احکام کے اسرار کو پوچھا کرتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم حضرت احدیت کے احکام کے اصلی رموز و مصالح سے اسی طرح بے خبر ہیں جس طرح دوسرے افراد اگر فرق ہے تو اصلاً احکام کے جاننے اور نہ جاننے میں ہے لیکن احکام کے رموز و مصالح ان میں ہم اور وہ مساوی حیثیت سے بے خبر ہیں۔ ہاں اچونکہ کچھ نہ کچھ ہماری نظر احادیث پر بھی ہے ممکن ہے کہ مختلف قسم کے نظائر کے

دیکھنے سے ہمارا ذہن بہ نسبت دوسرے اشخاص کے ذہن کے جلد پہونچے لیکن بحیثیت ایک انسان ہونے کے خالق کی حکمت سے مخلوق کو کیا نسبت ہوسکتی ہے۔ ہم بھی اسی طرح سے بے خبر ہیں جس طرح سے وہ شخص جو اپنے تئیں ناواقف کہتا ہے۔ وہ بے خبر ہے۔ بے شک تبادلۂ خیالات کا حق ہے علمی تحقیقات کی حیثیت سے لیکن عملی پابندی کی حیثیت سے نہیں۔ کیونکہ اگر عملی پابندی کو احکام کی وجہ دریافت کرنے پر معلق رکھا تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ ہم خدا کے حکم کے پابند نہیں ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک مالک نے یہ حکم دیا کہ اسوقت یہ خدمت بجالاؤ اگر وہ دانا ہے تو ضرور کوئی حکمت مد نظر رکھے گا۔ لیکن غلام کو یہ حق نہیں ہے کہ پوچھے کہ اسمیں کیا راز ہے۔ دنیا کو غلطی نہ ہو کہ میں نے غلام بنادیا تو اسلام غلامی کا حامی ہوگیا! یہ غلام خدا کا غلام ہے۔ ممکن ہے میں اسکو مستقل طور سے بیان کردوں کہ خدا نے انسانیت کو اپنی غلامی اور عبودیت کو اسی لئے یاد دلایا ہے کہ اس عبودیت کو فنا کردے جو دنیا میں رائج ہوگئی تھی۔ العبودیۃ جوھرۃ کنھھا الربوبیۃ خدا کی عبودیت ایک جوہر ہے جسمیں حریت کے راز مضمر ہیں یہ غلامی وہ ہے کہ جو ناز کا باعث ہے۔ سرمایۂ ننگ نہیں ہے بلکہ سرمایۂ ہزار افتخار ہے۔

درحقیقت علمی حیثیت سے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ آپ احکام پر غور کیجئے

اُن کو واجب الامتثال سمجھ لینے کے بعد غور کیجیے کہ اُن میں کیا کیا حکمتیں اور مصالح مضمر ہیں یہ درحقیقت وہ صورتیں تھیں جو اسلام نے دنیا کو علمی ترقی میں آگے بڑھانے کے لئے پیش کیں۔ عقائد کو عقل پر مبنی قرار دیا۔ مذہب کے اصول کو عقل پر مبنی قرار دیا۔ یہ کہا کہ عقل نہ ہو تو عبادت ناقص ہے۔ اسلئے کہ عبادت میں روح پیدا ہو جاتی ہے نیت کی وجہ سے الاعمال بالنیات اور عقل جتنی کامل ہو گی نیت میں جہت کمال زیادہ پیدا ہو سکے گی۔ اسی لئے بتلایا گیا کہ جتنی عقل ہو انسان میں اتنا ہی اجر ملیگا۔ اصول کافی میں یہ روایت موجود ہے کہ ایک شخص عابد تھا۔ ایک جزیرہ میں عبادت خدا میں دن رات بسر کرتا تھا ایک فرشتہ کا گذر ہوا فرشتہ کو تعجب ہوا اسکی عبادت پر بارگاہ الٰہی میں تمنا ظاہر کی اسبات کی کہ وہ اسکے ثواب کو جان لے۔

وہاں سے ثواب جو پیش ہوا وہ بنظر ظاہر میں کم معلوم ہوا اُس عبادت کے مقابلہ میں۔ معلوم ہوا کہ وہ عابد ظاہری حیثیت سے بہت زیادہ عبادت کرتا ہے مگر قوت عاقلہ کمزور ہے اسکا نتیجہ تھا کہ عمل کا ثواب گھٹ گیا جتنا زیادہ خلوص ہوگا اُتنا ہی عبادت میں وزن زیادہ پیدا ہوگا۔ یہ نہ سمجھے گا کہ ظاہری عبادت زیادہ ہے تو اجر بھی زیادہ ہے۔ خلوص کم ہے ثواب کم ہے۔ ظاہر کو نہ دیکھئے۔ باطن پر نظر ڈالئے۔

جتنی قوت عقل زیادہ ہوگی اُتنا ہی خلوص پیدا ہوگا۔ اور جتنا خلوص زیادہ ہوگا عمل بلند ہوگا۔

اگر کوئی عابد محراب عبادت میں زندگی گذار دے۔ اور علمی ترقی سے الگ رہے۔ اور ترقی کا عذر عبادت کو قرار دے تو اسکے سدباب کیلئے یہ کہدیا گیا کہ عبادت قبول نہیں ہے جو علم و عقل کے ساتھ نہ ہو۔

جناب رسالتمآبؐ فرماتے ہیں فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم۔ عالم کی فضیلت عابد پر اتنی ہے۔ جتنی ایک نبی کو فضیلت ہوتی ہے ایک فرد اُمت پر"۔

اس طرح سے علم و عقل کے معیار کو بلند کیا گیا۔ اور علمی ترقی کا دروازہ کھولا گیا۔ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم حدیث اتنی ہی ہے اسلئے میں نے اتنی ہی پڑھی "علم کا طلب کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے" وہ علم کونسا ہے؟ یہ دوسری چیز ہے۔ بے شک جو علم علم ہو اسکو فرض قرار دیا گیا ہے ہر مسلمان پر کہ وہ اسکو حاصل کرے۔ انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء" خدا کا خوف اگر کسی کے دل میں پیدا ہوتا ہو تو وہ وہی لوگ ہیں جو علم کے رکھنے والے ہیں۔ ارشاد فرمایا لا یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون "کبھی برابر نہیں ہوسکتے وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے" ارشاد فرمایا افمن جعلنا لہ نورا یمشی

بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منہا کیا وہ شخص جس کیلئے ہم نے نور قرار دیا ہے جسکی شعاعوں میں وہ راستہ طے کرتا ہے۔ وہ اسکے مثل ہو سکتا ہے جو تاریکی میں ادھر اُدھر ہاتھ پیر مار رہا ہو۔

لا یستوی الاحیاء ولا الاموات علم وجہل کی مثال۔ علم کو حیات قرار دیا اور جہل کو موت۔ علم کی ترقی کے راستوں کو کھولا۔ ہر شعبہ میں علمی ترقی کو کہا۔ ان الملٰئکۃ لتضع اجنحتہا لطلاب العلم۔ جو درحقیقت علم کے راستے میں چلتے ہیں ملائکہ اُنکے پیروں کے نیچے پر بچھاتے ہیں۔ یہ کہا کہ تستغفر لھم الحیتان فی الماء والطیر فی الھواء۔ اُنکے لئے مچھلیاں دریا میں اور طائر ہوا میں استغفار کرتے ہیں۔

درحقیقت اسلام ہی دنیا کا وہ مذہب ہے جو صحیح طریقہ سے دعوی کرسکتا ہے کہ اُس نے دنیا کو علم کے راستہ پر چلنے کی بحیثیت مذہب کے دعوت دی۔ دنیائے مذہب کے ذرہ ذرہ کو چھان ڈالئے مگر آپ کو علم کی اتنی حمایت نہ ملے گی جتنی قرآن میں اور حدیث میں ملتی ہے۔ اس طرح۔ اسلام۔ دنیا میں علمی ترقی کا صحیح رہنما بنکر آیا ہے۔ اسکے مقابلہ میں کوئی مذہب نہیں آسکتا۔

اسلام اور عملی ترقی

دنیا میں افراد انسانی نے امتیاز باہمی کے معیار قائم کرلیے تھے۔ مادہ پرست

دنیا مال و دولت کو سبب افتخار سمجھتی تھی۔ سلطنت و حکومت کو سبب عزت سمجھتی تھی۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جو کسی بڑے کی طرف انتساب کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے۔ گورے رنگ والے کالے رنگ والوں کو ذلت کی نظر سے دیکھتے تھے کسی خاص شخص کی اولاد والے دوسری نسل والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہی چیزوں نے کمالات انسانی کو خاک میں ملا دیا تھا انفرادی ترقیوں کے راستوں کو بند کر دیا تھا۔ اسلئے جو شخص وقار حاصل کرنا چاہے اُسکو انہی چیزوں کی ضرورت تھی۔ ایک عزت کا طالب مال و دولت کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک عزت کا طالب سلطنت حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جو لوگ ایسے تھے جنھیں قدرت نے کسی خاص خاندان میں پیدا کر دیا تھا۔ اُن کو تو یہ عزت بغیر کسی محنت کے حاصل تھی۔ نہ کہیں فوج کشی کی ضرورت تھی اور نہ محنت و مشقت کے برداشت کرنے کی حاجت۔

اسکا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا اپنے نفوس کو اخلاق سے سجنے کی طرف متوجہ نہ ہوئی۔ کسی کو اسکی ضرورت نہ محسوس ہوئی کہ وہ اچھا آدمی بنے تاکہ اسکی تعظیم کی جائے۔ ایک یہ چیز تھی جو قوت عمل کے کمزور کرنے کا باعث تھی۔ دوسرے مذہب کے غلط نظریات جو قائم ہو گئے تھے جیسے نصاریٰ کا عقیدہ "فدیہ" کہ مسیح سولی پر چڑھ گئے لہذا ہمارے تمام گناہوں کے

ذمہ دار بن گئے اور اب ہمارے لئے کوئی حکم نہیں ہے ہم آزاد ہیں۔ یہ خیال وہ تھا جس نے قوت عمل کو کمزور کر دیا۔

تیسری طرف عبادت کے مفہوم کا غلط سمجھ لینا۔ کہ عبادت صرف تنہائی کے مقام پر بیٹھکر یاد خدا کر لینا ہے۔ اسلئے عیسائیوں نے رہبانیت کو اختیار کیا کہ پہاڑوں پر۔ غاروں میں تنہائی میں بیٹھکر خدا کی یاد کیا کریں۔

چوتھی طرف نصاریٰ و یہود میں ایک غلط خیال یہ قائم ہو گیا تھا کہ چونکہ ہم اسکے سچے رسولوں پر ایمان لانے والے ہیں لہذا ہم اسکے محبوب ہیں۔ تو بھلا ہمکو وہ سزا کیوں دینے لگا۔ قرآن مجید میں انکے قول کا تذکرہ موجود ہے نحن ابناء اللّٰہ واحباؤہ "ہم خدا کے فرزند ہیں اور اسکے دوست ہیں"۔ اسکے بعد جو نتیجہ اس سے انکی ذہنیت کے باعث نکلتا تھا اس کی تشریح کر دی ہے۔ فلم یعذبکم بذنوبکم "تو اب وہ تمھیں تمھارے گناہوں کی سزا کیوں دینے لگا؟

یہ تمام باتیں وہ تھیں۔ مثالاً جو دنیا کے معیار کو پست کر رہی تھیں جو دنیا کو عملی حیثیت سے بے حس بنا رہی تھیں۔ لیکن اسلام نے ایک طرف اس ذہنیت کو۔ کہ دنیا میں سبب افتخار مال و دولت قرار دے لیا گیا تھا یہ کہکر باطل کیا۔ لا فخر للعربی علی العجمی ولا للقرشی علی غیر القرشی کوئی فخر نہیں ہے عرب کو عجم پر نہ قرشی کو غیر قرشی پر۔ اس طرح نسل انسان کے

افتخار کو باطل کیا گیا بعثت الی الاحمر و الاسود میں سرخ و سیاہ سب کی طرف مبعوث ہوا ہوں" کسی کو کسی پر فخر نہیں ہے۔ اس پر قرآن مجید نے نسلی امتیاز کو یہ کہکر باطل کیا انما جعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفو ہم نے تمکو مختلف قبیلوں میں جو الگ الگ کیا ہے تو اس لئے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان لو یعنی ناموں کے اشتراک کی وجہ سے شبہہ نہ ہو۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم لیکن تم میں سب سے معزز زیادہ وہی ہے جو سب سے زیادہ فرض شناس ہو اس طرح سے نسلی امتیاز کو غلط ثابت کیا۔ ملکی امتیاز کو باطل کیا۔ ارشاد ہوا کہ انما المومنون اخوۃ" جو بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے وہ سب ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ دنیا نے مختلف قسم کے معیار بنا لئے تھے۔ کچھ لوگوں نے ملکی تفریق قائم کی تھی۔ کچھ لوگوں نے نسلی تفریق قائم کی تھی اسلام نے ایک ہیئت اجتماعی اسلام کی تشکیل کی جب سب رشتہ دار ہو گئے تو پھر تفوق ایک کو دوسرے پر کیسا؟ یہ حد تھی ملکی تفریق کو مٹانے کی کہ ملک حبش کے رہنے والے بلال۔ جو اتفاق سے سیاہ رنگ بھی ضرور تھے۔ اُن کو یہ امتیاز خصوصی عطا کیا گیا کہ نماز کیلئے اذان دینے والے وہی ہوں۔ ایک طرف شہرت و اعلان یہ سب گمنام اور خاموش لیکن موذن سربلندی کے ساتھ اپنی آواز کا سنانے والا۔ دوسری طرف ایک حیثیت سے رہنما۔ راستہ دکھلانے والا۔ لوگ

سونے والے ۔ وہ جگانے والا ۔لوگ غافل ۔ وہ ایک خبر دینے والا یہ
امتیاز کچھ طبیعتوں پر گراں بھی گذر رہا تھا لوگوں کو کھل بھی رہا تھا کہ یہ امتیاز
خصوصی رسولؐ کی بارگاہ سے اُس شخص کو عطا ہو جائے جو "ش" کو "س"
کہتا ہے لیکن کیا کہنا اُس رسول کے طرز عمل کا جس نے تمام معترضین کو یہ
کہکر خاموش کر دیا سین بلال شین عند اللہ " بلال کی "س" خدا کے
یہاں "ش" ہے ۔ روح خلوص بڑھنے کے بعد عمل کی ظاہری بصورتی
کو بھی چھپا دیتی ہے کوئی باکمال آپ کے پاس آئے اُسکا کمال آپ کو اُسکی
تعظیم پر مجبور کرے گا ۔ چاہے صورت کریہہ بھی کیوں نہ ہو ۔ جیسے ایک انسان
کا ظاہری جسم اور اسمیں اُسکی روح ۔ اگر روح صاحب کمال ہے تو اُس
ظاہری جسم کی صورت چھپ جائے گی ۔ ویسے ہی عمل کی ظاہری شکل اور
اسمیں روح خالص ۔ اگر روح خالص اور درست ہے تو عمل کو بھی اُس
شخص کے درست کر دے گی ۔ بیشک کوتاہی اگر انسان کی اختیاری ہو
تو قابل الزام ہے ۔ اور اگر قدرت کی طرف سے بنایا ہی ایسا گیا تو مورد الزام
بالکل نہیں اس طرح سے حبشہ کے رہنے والے کو عزت دی گئی ۔ ملک فارس
کے رہنے والے یعنی سلمان ۔ کیا کہنا اُس عزت کا ۔ قریب کے بیٹھنے والے غیر
ہو گئے ۔ وہ دور دراز ملک کا رہنے والا عزیزوں سے بڑھ گیا ۔ وہ کیا
چیز تھی ؟ وہ قوت عمل تھی ۔ ایک آدمی دس دس گز خندق کھود رہا تھا

گروہ سلمان ہی تھے جو دس آدمیوں کے برابر کام کر رہے تھے۔ ہر جماعت کی خواہش ہوئی کہ سلمان کو اپنے میں داخل کر لیں۔ مگر جب رسولؐ کے سامنے مسئلہ پیش ہوا۔ تو فرمایا کہ "سلمان نہ تم میں سے ہیں۔ اور نہ تم میں سے۔ بلکہ سلمان ہم میں سے ہیں۔"

مال و دولت و استغنائے ظاہری کی بنا پر جو امتیاز قائم کر لیا گیا اس کو اسلام کی جانب سے یہ کہکر غلط قرار دیا گیا کہ

واللہ الغنی وانتم الفقراء۔

بس ایک خدا کی ذات ہے جو غنی ہے اور تم سب فقیر ہو۔ اب ایک دوسرے پر فخر کرنے کا حق نہیں رہا مال و دولت کا زیادہ ہونا۔ انسان کے لیے استغنا کی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ فقر کی دلیل ہے جبقدر مال و دولت زیادہ ہوگی اتنے ہی ضروریات زیادہ ہوگی جتنے ضروریات زیادہ ہونگے اتنی ہی احتیاج زیادہ ہوگی۔ سچ بتائیے! وہ زیادہ غنی ہے جو کم افراد کا محتاج ہو۔ یا وہ جو زیادہ افراد کا محتاج ہو۔ درحقیقت غنی تو وہ ہے جو کسی کا بھی محتاج نہ ہو۔ اب آپ اگر غور کیجیے تو غنی تو کوئی فرد ہی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا مدارج احتیاج مختلف ہوے۔ ایک فقیر اور محتاج جو اپنے

ہاتھ سے زراعت کرتا ہو۔ وہ بہت زیادہ غنی ہے بہ نسبت اُس بادشاہ تاجور کے۔ جو اپنی زندگی کا ایک لمحہ نہیں گذار سکتا جبتک ہزاروں آدمی اُسکے انتظام ملک۔ انتظام خانہ داری کے اسباب مہیا نہ کریں جتنا جتنا دنیا میں تفوق بڑھتا جائیگا۔ اُتنی ہی احتیاج زیادہ ہوتی جائیگی مال و دولت کو "حطام" کی لفظ سے تعبیر کیا مال و دولت کو یہ کہا کہ ہاتھ کا میل ہے۔ پھر ایک انسان اگر اپنے جسم پر زیادہ میل ہونے سے فخر کر سکے۔ تو اُس مال و دولت پر فخر کرنا بھی زیب ہو۔ اس طرح مال و دولت کے امتیاز کو مٹایا۔ بے شک مال و دولت کو اگر کوئی شخص ذریعہ قرار دے اسباب خیر کا۔ امور خیر کے انصرام کا۔ تو یقیناً یہ مال و دولت سبب نجات اُخروی بن سکتا ہے لیکن اسوقت مال و دولت سبب امتیاز نہیں ہے۔ بلکہ وہ عمل سبب امتیاز ہے۔ مال و دولت ذمہ داریوں کو بڑھاتا ہے۔ انسان کو زیادہ پابند بناتا ہے۔ انسان کو زیادہ خطرہ میں ڈالتا ہے۔ بہت سے معاصی ہیں جو انسان سے محض دولت مندی کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر وہ سبک بار ہوتا تو شاید وہ اُن معاصی میں مبتلا نہ ہوتا۔ اسکے بعد حکومت و سلطنت، وہ تو مال و دولت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ مگر اُسکو یہ کہا کہ الملک بید اللّٰہ یوتیہ من یشاء اگر سلطنت اپنی ہوتی تو اُسپر فخر بھی کیا جاتا۔ لیکن غیر کی دی ہوئی چیز! ایک عاریتی

چیز! اُسپر فخر کیسا؟ اُسپر اعتماد اور بھروسا کیسا؟ کتنے سر تھے۔ جو صبح کو تاج شاہی رکھتے تھے شام کو ٹھوکریں کھاتے ہوئے دکھائی دیے۔ کتنے آدمی کل تک چتر شاہی جنکے سروں پر تھے۔ دوسرے دن قبر بھی نصیب ہوئی اُسپر فخر کیسا؟ نام ونسب۔ اس امتیاز کو قدرت نے غلط ثابت کیا۔ آپ کے سامنے نوح علیہ السلام کا قصہ پیش کیا۔ طوفان کے اُٹھتے ہوئے موج اُسمیں ایک کشتی۔ اُسپر حضرت نوح اور اُنکے تمام اہلبیت۔ اُن کا بیٹا پانی میں غرق ہو رہا تھا۔ نوح آواز دیتے ہیں۔ "میرے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا" یا بنیّ ارکب معنا ولا تکن مع الکافرین اس واقعہ کا تذکرہ مدنظر نہیں بیٹے نے سماعت نہیں کی۔ موجوں نے ڈھانپ لینا چاہا نوح متوجہ ہو گئے خدا کی طرف اُس کے ایک وعدہ کا واسطہ دینے لگے ان ابنی من اھلی وان وعدك الحق "میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے" وعدہ یہ ہوا تھا کہ تمھارے اہل غرق سے محفوظ رہیں گے قدرت کی طرف سے جواب مل گیا۔ انہ لیس من اھلك انہ عمل غیر صالح "یہ تمھارے اہل میں سے نہیں ہے یہ تو عمل غیر صالح ہے" اس طرح فرزندی کے رشتہ کو جو کسی نبی کی طرف استناد رکھتا ہو۔ بے اعتبار ثابت کیا۔ مگر جیسا کہ بیان ہوا غیر اس عمل کی وجہ سے اپنا ہو گیا۔ سلمان اہلبیت میں داخل ہو گئے۔

بر عمل وہ چیز ہے جو مجتمع اجزا کو منتشر کرتا ہے اور منتشر عناصر کو بہم بناتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے۔ اور اس طرح اُس نے عملی طاقت کو نوع انسانی کے بلند کیا۔ کہ دنیا کسی چیز کو سبب امتیاز نہ سمجھے۔ جو کچھ سبب امتیاز قرار دیا جائے وہ عمل صالح ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

قرآن مجید میں خطاب ہے رسالتمآبؐ سے دوسروں کو تعلیم دینا منظر ہوتا ہے تو کسی خاص شخص سے خطاب کر کے کہا جاتا ہے۔ رسولؐ کی شخصیت سے بڑھکر اور کسی کی شخصیت دنیا میں نہیں ہو سکتی اسلام کے نقطۂ نظر سے۔ مگر شخصی خصوصیت کو معیار عمل کے سامنے بے اعتبار ثابت کرنے کیلئے ارشاد ہوا۔ لئن اشرکت لیحبطنّ عملاث ولتکونن من الخاسرین

اللہ اکبر! خدائے ملک و ملکوت کا جاہ و جلال ہے کہ رسولؐ کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے یقیناً رسولؐ کو اسکی ضرورت نہ تھی۔ مگر ہمکو سنانے کی ضرورت تھی۔ کہا جا رہا ہے" اگر تم شرک کرو تو تمھارے اعمال حبط ہو جائیں۔ اور تم روز قیامت نقصان اُٹھانے والوں میں محسوب ہو۔ ارشاد ہو رہا ہے یہ دکھانے کے لئے کہ خصوصیت شخصی کوئی چیز نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ عمل ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہوا لوا تبّعت اھواء ھم من بعد ماجاءك من العلم انك اذا لمن الظالمین اگر تم اُن کی خواہشوں کی

پیروی کرنے لگو باوجود اُس علم کے جو تم کو حاصل ہو گیا ہے تو کیا ہو گا؟ تمھارا شمار ظالمین میں ہو جائیگا۔

ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ ولوا تبعت اھواءھم بعد ماجاءک من العلم مالک من اللہ من ولی ولا نصیر "اگر تم اُنکی پیروی کرو اسکے بعد کہ تمھارے پاس علم آچکا تو یاد رکھو۔ پھر ہم تمھارے ساتھ نہیں ہیں" اس طرح یہ ظاہر کیا کہ رسولؐ کی بھی شخصیت کے ہم جانبدار نہیں ہیں۔ ہمکو تو رسولؐ کا عمل محبوب ہے۔ رسولؐ کے ذاتی کمالات محبوب ہیں۔ رسولؐ کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بے شک رسولؐ کی طرف اُن باتوں کی نسبت دینا ویسا ہی تھا جیسے یہ کہا کہ لوکان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا "اگر زمین میں دو خدا ہوتے تو فساد ہوتا"

حقیقتاً فرض محال کے طور پر کہا گیا ہے لیکن نتیجہ یہ ضرور نکلتا ہے کہ درحقیقت عمل ہی وہ چیز ہے جو معیار موالات ہے۔ معیار محبت الٰہی ہے۔ اس خطاب کو رسولؐ اپنے عزیزداروں کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتے ہیں۔ یا بنی عبد المطلب انی لا اغنی عنکم من اللہ شیئا سنو اے میرے خاص رشتہ دارو اور عزیزو! میں خدا کے مقابلہ میں تمھاری کوئی جانب داری نہیں کر سکتا۔ خدا کی تائید تمھارے لئے بہر حال ضروری ہے۔ ایک مقام پر جہاں ازواج رسولؐ کو مخاطب

کیا گیا ہے۔ وہاں یہ کہا ہے کہ صرف انتساب کی وجہ سے تمہاری ذمہ داری زیادہ ہے۔ انتساب کی وجہ سے مقام عمل میں تمہیں پابندی زیادہ کرنا چاہیئے لستن کاحد من النساء تم اور عورتوں کے مثل نہیں ہو۔ اور عورتیں اگر کسی حکم کے خلاف کریں تب بھی وہ اتنا قابل گرفت نہیں ہے جتنا تمہارا مخالفت کرنا۔ تمکو امتیاز خصوصی حاصل ہے۔ لہذا تمکو ان احکام کا بیشتر پابند ہونا چاہیئے۔

اسکے بعد یہ ارشاد ہے من یات منکن بفاحشۃ مبینۃ یضاعف لھا العذاب ضعفین۔ اگر تم میں سے کسی نے کوئی گناہ کیا تو میں اسکی سزا کو دونا کردوں گا۔ اس طرح انتساب کی دشواری کو تبلایا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ خصوصیت کے ساتھ عمل کی جانچ سختی کے ساتھ ہوجاتی ہے۔ امیر المومنینؑ نے ایک خط میں جو ابن عباسؓ کو تحریر فرمایا ہے یا کسی اور عزیز کو۔ بہت سے اہل سیر نے ابن عباسؓ تحریر کیا ہے کسی حضرت کے عزیز نے یہ صورت اختیار کی تھی (حبّ دنیا اس سے غیر معصوم کا مستثنیٰ ہونا کب ضروری ہی) وہ آپ کی طرف سے گورنر تھے بصرہ کے۔ اور خزانہ بیت المال کے اموال کو منتقل کر دیا اپنے گھر کی طرف۔ اس موقعہ پر امیر المومنینؑ نے خط تحریر فرمایا۔ وہ خط بہت طویل الذیل ہے۔

اس میں فرماتے ہیں واللّٰہ لو انّ الحسن والحسین فعلا مثل الذی

فعلت ما کان لهما عندی هوادة ولا ظفرا منّی بارادة حتی اخذ الحق منهما۔ خدا کی قسم اگر حسنؑ و حسینؑ سے یہ طرز عمل صادر ہوتا۔ جو تم سے ہوا تو یاد رکھو کہ میں اُن کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرتا اور اُن سے حق کو حاصل ضرور کرتا"۔ اس طرح سے ہر قسم کے انتساب کو عمل کے مقابلہ میں بے کار ثابت کیا گیا ہے۔ عمل قابل فخر ہے بے شک اگر اسکے ساتھ انتساب بھی ہو تو وہ انتساب عمل کے ساتھ ملکر ایک شرف کا باعث ہے لیکن یہ قاعدہ ہے کہ ہر چیز جسمیں شرف زیادہ ہو اُس کی ذمہ داری بھی زیادہ ہو جاتی ہے یعنی جاہل سے بڑھکر عالم کی ذمہ داری ہے عالم سے زیادہ انبیاؑ کی ذمہ داری ہے۔ انبیا میں جتنا درجہ زیادہ قرب کا بڑھتا جائے اتنی ہی ذمہ داریاں بھی بڑھتی جائینگی۔

وہ چیزیں جو عام افراد کے لئے قابل اعتراض نہیں ہیں وہ علمائے سے قابل اعتراض ہیں۔ وہ چیزیں جو اُن سے قابل اعتراض نہیں ہیں وہ انبیاء سے قابل اعتراض ہیں۔ شرف کے بڑھنے سے ذمہ داری بڑھتی ہے اور اگر اس ذمہ داری کے پورا کرنے کے ساتھ شرف بھی ہو تو کیا کہنا! لیکن اگر شرف کے ساتھ ذمہ داری مفقود ہوگئی تو پھر وہ شرف انسان کے لئے عار و ننگ ہوگا اسی صورت سے انتساب کسی ایسی ہستی کی طرف جو صاحب شرف ہو قابل فخر ہے لیکن اُسی وقت جبکہ عار و ننگ کا دھبّا

دامن پر نہ آیا ہو۔

وہ چیزیں جن کو اسلام نے طرۂ امتیاز قرار دیا ہے۔ جیسے علم عمل نبوت امامت۔ رسالت۔ ان چیزوں کو بجائے خود قدرت نے سربلندی عطا کی ہے۔ بیشک اُن کی طرف انتساب قابل شرف ہوگا لیکن ذمہ داری کے ساتھ ساتھ۔ یعنی سید اپنی سیادت پر گھمنڈ نہ کرلیں کہ ہم سید ہیں بلکہ اسکے ساتھ عمل کی ذمہ داری کا زیادہ احساس کریں۔ اگر کسی غیر سید سے لغزش ہو تو وہ اتنا قابل اعتراض نہیں ہو جتنا قدر سید سے لغزش ہونا۔ یہ ایک طرف تو معصیت الٰہی ہے دوسری طرف اُس رشتہ کی توہین ہے جو رسولؐ کے ساتھ ہے رسولؐ کے ساتھ انتساب رکھنے والا اگر معصیت کا مرتکب ہو تو اس سے معصیت کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ جس طرح ایک گناہ کو آپ اپنے گھر میں کیجئے۔ اور اُسی کو مسجد میں کیجئے۔ تو اُسکی اہمیت بڑھ جائیگی اسی طرح سے یہ معصیت جو ایک رسولؐ کے منتسب کی طرف سے ہو ایک طرف گناہ ہو اور دوسری طرف رسولؐ کی توہین ہے۔

عمل اور محبّت

کسی قسم کا انتساب عمل کے مقابلہ میں قابل فخر نہیں سمجھا جائیگا، یہ انتساب وہ ہیں جو ظاہری حیثیت سے انتہائی قوت رکھتے ہیں یعنی کسی کی

اولاد ہونا۔ اسکے بعد کسی کا عزیزدار ہونا۔ اسکے بعد ہے کسی کا دوست ہونا پہلا درجہ ہے اولاد کا۔ اسکے بعد عزیزوں کا۔ پھر دوستوں کا۔ مقام انتساب میں جب وہ انتساب جو فرزندی کا تھا نظر اعتبار سے گرادیا گیا عمل کے مقابلہ میں اور وہ انتساب جو عزیزداری کا تھا۔ وہ بے اعتبار ہو گیا عمل کے مقابلہ میں تو وہ انتساب جو ادعائے دوستی کی بنا پر ہو وہ عمل کے مقابلہ میں کیا وزن رکھتا ہوگا۔ رسولؐ کی زبانی جبوقت خطاب ہوا اور معیار محبت تبلایا گیا تو ارشاد ہوا ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ اگر خدا کو دوست رکھتے ہو تو میرا اتباع یعنی عملی اطاعت کرو۔ خدا بھی تم کو دوست رکھے گا محبت کا معیار اتباع کو قرار دیا گیا۔ قاعدہ وقانون محبت بھی یہی ہے محبت کے سچے اور جھوٹے ہونے کی تفریق اطاعت اور اتباع سے ظاہر ہوتی ہے۔ کوئی شخص آپ کی دوستی کا دم بھرنے والا ہے تو آپ اسکی محبت کو کس طرح جانچتے ہیں؟ اس محبت کا معیار یہ ہے قانون عقل وفطرت میں کہ عمل سے جانچئے۔ کوئی حکم دیا جائے۔ اگر اسپر عمل پیرا ہو تو معلوم ہوگا کہ آپ کا دوست ہے اور کوئی عذر کرے تو سمجھ لیجئے گا کہ یہ محبت نہیں ہے۔ اب جتنا اُسے محبت کا دعویٰ ہو۔ اُتنا ہی اُسے سخت حکم دیا جائیگا جتنی زیادہ خصوصیت کا آپ سے دعویدار ہے اُتنا ہی زیادہ سخت فرائض سپرد کئے جائینگے۔ درحقیقت محبت کا دعویٰ اتباع کے ساتھ

سند قبول حاصل کرتا ہے۔ تمام دنیا اس طرز عمل پر متفق ہے یعنی ہر قسم کی محبت کا معیار یہی قرار دیا گیا ہے کہ "کہنے پر زیادہ چلے" اگر کہنے پر نہیں چلتا تو آپ کہیں گے کہ دوست نہیں جس کی محبت کرتا ہے اسکے کہنے پر بھی چلتا ہے۔ اطاعت بھی کرتا ہے۔ آپ جائزہ لے لیجئے۔ میری پرواز خیال بھی وہاں تک نہیں پہونچ سکتی کہ میں خدا کے ساتھ براہ راست محبت کر دں۔ لیکن یہ دیکھیے کہ جو لوگ درحقیقت خدا کے دوست تھے تو کیا خدا نے ان کو اس محبت کے بعد مطلق الشان چھوڑ دیا تھا؟ احکام و اوامر سے مستثنیٰ کر دیا تھا؟ یا حکم اور بھی زیادہ سخت کر دئے تھے۔

انبیاؑ و مرسلین بے شک براہ راست خدا کی محبت کے دعویدار تھے دیکھیے خدا کی محبت کا دعویٰ جو وہ کرتے تھے تو خدا نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ خدا کی طرف سے اس محبت کو معیار امتحان پر جانچا گیا۔ خود سمجھنے کیلئے نہیں تھا بلکہ دنیا کے سامنے ظاہر کرنا تھا۔ اسنے عمل سے امتحان لیا آپ واقعات سنا کرتے ہیں لیکن نتیجہ نکالنے کی کوشش نہیں کرتے۔ آخر ابراہیمؑ کو حکم دیدیا گیا۔ ذبح اسمٰعیل کا۔ یہ محبت کو عمل کے اعتبار پر کسنا تھا اسکے بعد اگر عمل معیار امتحان پر کامل ثابت ہوا تو بیشک پھر محبت کی سند بھی مل گئی۔ یہ کیا تھا کہ ابراہیمؑ کو حکم دیدیا کہ نمرود کے دربار میں جاکر تبلیغ کرو۔ حالانکہ معلوم تھا کہ آگ میں پھینکے جائینگے۔ یہ صرف الٰہی تھا

کہ عمل کے مقام میں کنارہ کشی نہیں کرتے۔ جب عمل کیا۔ تب معلوم ہوا کہ
خدا کی محبت کا دعویٰ سچا تھا خلیل کا لقب بھی مل گیا۔ عالم کائنات
کی معزز ترین ہستی یعنی رسالتمآبؐ اُن سے بڑھکر تقرب الٰہی کسی کو حاصل
نہیں ہے۔ آپ دیکھئے اس حبیب کے لقب کا نتیجہ کیا ہے۔ کیا صرف زبانی
دعوے سے محبت قابل تسلیم ہو گئی۔ آپ یاد رکھئے جتنے فرائض ہمارے
ہیں اُن سے زیادہ اُن کے اوپر عائد کئے گئے تھے۔ نماز شب اگر ہم ترک
کردیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن اُنکے لئے نماز شب واجب تھی
جتنے احکام فرض تھے دوسروں پر اُن پر سب سے بڑھکر عمل کیا اس کے علاوہ
بھی کچھ احکام اُنکے ذمہ واجب الادا تھے جو ہمارے لئے نہیں ہیں
تو درحقیقت محبت معیار حقانیت پر اُسوقت کامل اترتی ہے جب اتباع
اس کا ثبوت دیرہا ہو۔ ورنہ وہ دعوائے محبت انسان کے لئے سبب ایذائے
نفس ہوگا۔ وہ دعوائے محبت کہ جسکے ساتھ اتباع نہ ہو۔ انسان کیلئے
اُن لوگوں کی خوشنودی اور رضا کا باعث نہ ہوگا جنکے ساتھ دعوائے
محبت ہورہا ہو۔ میں نے سال گذشتہ تفصیل سے عرض کیا تھا کہ محبت
کا خاصہ یہ ہے کہ جسکے ساتھ محبت کرے اسکے ساتھ چلنے کی کوشش
کرے۔ اسلام کی جانب سے محبت اہلبیت کی صرف اسلئے تھی کہ اُن کے طریق
عمل پر چلنا آسان ہو جائے۔ فطرت کا تقاضا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ

محبت ہو گی تو وہ اسکے ساتھ چلے گا۔ اگر محبت زیادہ ہو گی تو چلنا آسان ہو جائیگا محبت کے دعوے کو ائمہ معصومین نے بھی اطاعت ہی کے معیار پر جانچا۔ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں سہل خراسانی حاضر ہوئے۔ انھوں نے کہا آپ اپنے حقوق کے طلب کرنے کے لئے تلوار کیوں نہیں اٹھاتے۔ حضرت نے فرمایا "اعوان وانصار کہاں ہیں" سہل نے کہا "حضور کے قدموں پر جان نثار کرنے والے دنیا میں بہت ہیں۔ اسوقت ایران میں ہزاروں تلواریں ہیں جو آپ کے اشارہ پر کھنچ سکتی ہیں۔ وہ سب آپ کے دوست ہیں"۔

یہ سنکر حضرت نے ذرا دیر خاموشی اختیار فرمائی پھر خادم کو بلا کر حکم دیا کہ تنور میں آگ روشن کرو۔ آگ روشن ہو گئی۔ آپ سہل کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا "سہل اس تنور میں داخل ہو جاؤ"۔ اُنکے جسم میں لرزہ پڑ گیا معافی طلب کی حضرت نے سکوت کیا۔ تھوڑی دیر میں اُدھر سے ہارون مکی داخل ہوئے۔ ابھی نعلین ہاتھ میں تھی۔ جواب سلام کے بعد سب سے پہلے حضرت نے اُن سے بھی فرمایا کہ "اے ہارون مکی! اس تنور میں داخل تو ہو جاؤ"۔ انھوں نے یہ بھی نہیں دریافت کیا کہ واقعہ کیا ہے۔ فوراً تنور کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محبت کی کسوٹی ہے حکم کا اتباع۔ امام جعفر صادق (علیہ السلام) فرماتے ہیں۔ اپنے اصحاب کو مخاطب کر کے

من اطاع اللّٰہ فھو لنا محب و من عصی اللّٰہ فھو لنا عدو جو شخص خدا کی اطاعت کرے وہ ہمارا دوست ہے اور جو خدا کی معصیت کرے وہ ہمارا دشمن ہے۔ میں نے جو عرض کیا تھا کہ اگر انتساب کے ساتھ معصیت ہو تو معصیت کا وزن بڑھ جاتا ہے اسلئے کہ ایک طرف تو معصیت ہے اور دوسری طرف توہین ہے۔ اسلئے فرمایا۔ کونوا لنا زینا ولا تکونوا علینا شینا۔ "تم ہمارا شیعہ اپنے تئیں کہتے ہو تو اپنے طرز عمل سے ہمارے لئے سبب نازش بنو۔ ہمارے لئے سبب عار و ننگ نہ بنو"۔ اگر ہم اپنے تئیں اُن حضرات کی طرف منسوب کریں اور عمل میں کوئی پابندی نہ کریں تو ہم نے اہانت کی اس انتساب کی۔ اسکے ساتھ توہین ہے اُن افراد کی جن کی طرف وہ انتساب ہو رہا ہے۔ پھر جسوقت ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے انہی فرائض کے قائم کرنے کے لئے اپنی جانیں دیدیں۔ انھوں نے اسی پابندی شریعت کے رواج دینے کے لئے اپنے تئیں ظاہری حیثیت سے فنا کر دیا۔ نماز کی اہمیت اس حد پر کہ امیر المومنینؑ کا مصلیٰ جنگ صفین میں دونوں لشکروں کے درمیان بچھا دیا جاتا ہے۔ ابن عباسؓ عرض کرتے ہیں کہ ہم تو جنگ کرتے ہیں۔ یہ نماز کا موقع ہے؟ فرماتے ہیں "اسی نماز کے لئے تو جنگ ہو رہی ہے" امام زین العابدین علیہ السلام کے احتضار کا عالم۔ وفات کے پہلے تمام اعزا اور احباب کو جمع کیا آخری بات

جو زبان سے نکلی وہ تین مرتبہ "الصلوٰۃ" "الصلوٰۃ" "الصلوٰۃ" اسکے بعد زبان بند ہو جاتی ہے۔ کوئی مرنے والا مرتا ہے تو اعزا اور احباب کو فکر ہوتی ہے کہ آخری وصیت کیا کی۔ اس کو حتی الامکان پورا کرتے ہیں۔

ہم محبت کا دعویٰ کر رہے ہیں اور اُن چیزوں کو جنھیں قائم کرنے کیلئے اُنھوں نے اپنی جانیں دیں۔ گھر بار لٹا دیا۔ جسکے قائم کرنے کے لئے مرتے مرتے وصیتیں کیں اُن چیزوں کو ہم اپنے اعمال سے پامال کریں۔ ہم انکی محبت کو بہانہ قرار دیں ان احکام کے مٹانے کا۔ یہ تو درحقیقت ہماری دوستی نہ ہوگی۔ ہم سنا کرتے ہیں واقعات کربلا۔ اُن سے سبق کیوں نہیں لیتے۔ کیا وہ بے قدر چیز تھی جسکے لئے آخری شب۔ ایک شب کی مہلت لی گئی، جبکہ دشمن کی صفیں حملہ آور ہوں اُسوقت یہ کہا جائے کہ ہم کو نماز کی مہلت دیدو۔ اور پھر معلوم بھی تھا کہ اسپر جواب کتنا سخت ملے گا۔ یہ کیا تھا؟ عبادت خدا کی اہمیت تھی جس کا ایسے ایسے اوقات میں خیال رکھا۔ انھی چیزوں کو ہم چھوڑ دیں۔ اور محبت کا دعویٰ بھی کریں یہ ہمارے لئے سبب نازش نہیں ہے۔ بلکہ سبب وبال ہوگا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ آپ کے نامہ اعمال حضرت حجت ع کے سامنے پیش ہوا کرتے ہیں۔ حضرت اسپر نظر فرماتے ہیں۔ اگر اچھے عمل نظر آئے تو چہرہ پر بالیدگی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر برے عمل پیش ہوتے ہیں تو آنسو نکل آتے ہیں۔ ہم اپنے

امام کے گریہ وبکا کے باعث ہوں اور پھر دوست سمجھے جائیں۔ درحقیقت اسلام کے تعلیمات قوت عمل کو ترقی دینے والے ہیں۔ اسلام نے محبت کا آپ کو حکم دیا۔ تو وہ حقیقتاً عمل کی اصلاح کا حکم تھا۔ اسلئے کہ ایسے افراد جو سرتاپا مجموعہ کمالات ہیں جو سر سے پاؤں تک نمونہ ہیں تعلیمات اسلام کے فطری قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی کو دوست رکھتا ہے وہ اسکے لباس کو بھی دوست رکھتا ہے اسکے افعال کو بھی دوست رکھتا ہے۔ الناس علی دین ملوکھم سلطنت کے اقتدار کی وجہ سے بادشاہ کا اثر دل پر چھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہنیت تبدیل ہو جاتی ہے یہ وہ اثر ہے جو جبری سلطنت کے تسلط سے دل پر پڑتا ہے لیکن اگر کسی کا حقیقی اثر دل پر قائم ہو جائے تو ناممکن ہے کہ انسان اسکے اخلاق وعادات سے نفرت کرے۔ اور بیزار ہو۔ درحقیقت ظاہر باطن کا آئینہ ہوتا ہے اسلئے کہ تمام اعضاء وجوارح تابع دل ہیں۔ اگر دل کسی طرف مائل ہو گیا۔ تو پھر ناممکن ہے کہ اعضا وجوارح سرتابی کر جائیں۔ یہ وہ سلطنت نہیں ہے جسمیں کبھی بغاوت ہوتی ہو۔ سب دل کے مطیع ہیں۔ یہ کبھی مخالفت نہیں کرتے۔ اگر دل پر کسی کا سکہ قائم ہو جائے تو اعضاء وجوارح بھی متاثر ہونگے۔

من تشبہ لقوم فھو منھم " جو شخص کسی قوم سے شباہت اختیار کرے انہی کے ساتھ محسوب ہوگا۔ یہ شباہت دلیل ہے اس بات کی کہ

اُسکا میلان اسی طرف ہے۔ یہ اسلام کی تاکید کہ اہلبیت کے ساتھ محبت کرو اسی لئے تھی کہ محبت کے ذریعے سے دل پر سکہ قائم ہو جائے پھر تمام اعضاء وجوارح خود ہی دل کے راستے پر چلیں گے۔ درحقیقت محبت کا حکم تمہید عمل تھا۔ یہ نہ سمجھئے کہ میں محبت کی اہمیت کم کر رہا ہوں۔ سال گذشتہ ابھی عرض کر چکا ہوں کہ محبت کا حکم انسان کی عملی اصلاح کے لئے ہے۔ خدا کی دی ہوئی طاقتوں کو انہی راستوں پر صرف کرنا یہ شکر الٰہی ہے اس کا ذریعہ ہے معرفت باری تعالیٰ اس لئے درحقیقت معرفت باریتعالیٰ بھی عملی اصلاح کے لئے ہے اس معرفت باری ہی کی دوسری مثال محبت رسولؐ واہلبیت رسولؑ کو سمجھ لیجئے۔ رسالتمآبؐ اور اُن کے اہلبیتؑ اطہار کی محبت درحقیقت ایک کامیاب ذریعہ ہے اُنکے طریق عمل پر چلنے کا۔ ہم نے کیا اصلاح عمل کی کوشش کی؟ یہ ہماری غلط ذہنیت ہے۔ ہم اُس عہد سے بعید ہو گئے جب ہدایات کی بارش ہو رہی تھی۔ دور ہوتے ہوتے ہمارے ذہنیتوں میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ دنیا سہولت کو پسند کرتی ہے جسمیں زیادہ ظاہری آسانی ہوئی وہی طبائع کے اندر راسخ ہو گیا۔ بس زبان سے کہدیا کہ ہم محب ہیں۔ میں نے سابق میں اشارتاً بیان کیا کہ نصاریٰ نے اسی طرح سے قوت عمل کو سلب کیا کہ کہا کہ مسیح جو دنیا سے اُٹھے تو سب گناہوں کی ذمہ داری لیتے گئے۔ انکے

سولی پر چڑھ جانے نے ہمکو آزاد کر دیا اب ہم پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے اسلام نے اسکو باطل قرار دیا۔ لا تزر وازرۃ وزر اخری۔ کوئی ایک دوسرے کے گناہ کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اس سے عیسائیت کی جو تعلیم تھی اُس کو غلط ثابت کیا لیکن کیا یہ افسوسناک بات نہ ہوگی کہ بعض لوگوں کے ذہن میں ہم میں سے یہ خیال قائم ہو جائے کہ درحقیقت حضرت سید الشہداؑ انہی معنی میں نجات دہندہ ہیں جن معنوں میں عیسائی مسیح کو نجات دہندہ خیال کرتے تھے۔ ہم نے ذاکروں کی زبانی سن لیا کہ حضرت نے گناہگاروں کے لئے شہادت اختیار کی۔ لہٰذا اب جو چاہیں کریں۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کو گناہ کی ترقی کا ذریعہ قرار دے لیا جس چیز کے قائم کرنے کے لئے اُنھوں نے جان دی۔ ہم نے اپنی غلط ذہنیت کے ذریعہ سے اُنکی شہادت کو اُسکے پامال کرنے کا باعث قرار دے لیا۔ ہم نے امام حسین علیہ السلام کو اپنے معاصی کے حق بجانب ثابت کرنے کا بہانہ قرار دیا۔ ہم نے کبھی کوشش نہیں کی اس بات کو سمجھنے کی کہ حسینؑ کس طرح سے نجات دہندہ ہیں اُمت کے۔ اُنھوں نے بیشک ہماری نجات کے سامان مہیا کرنے کے لئے اپنی جان دی۔ لیکن ہم نے کبھی اسکے معنی سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر آپ حالات کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ دنیائے اسلام سے اسلام کی حقیقی صورت رخصت ہو چکی تھی۔

دنیا میں معصیت کی تاریکی تھی۔ اطاعت الٰہی ایک فراموش شدہ چیز ثابت ہو چکی تھی۔ دنیا بادشاہوں کے راستوں پر چل رہی تھی۔ پھر جبکہ وہ بادشاہ خلافت اسلامیہ کا لباس بھی پہن چکے ہوں۔ مذہبی تخت پر بیٹھنے والا۔ ہر قسم کے فسق و فجور کا مرتکب ہو رہا ہو۔ بقول ابن حجر مکی قریبی رشتہ داروں یعنی ماں اور بہنوں کو نہ چھوڑا جاتا ہو"۔ غسیل الملائکہ کی زبانی وہ کہتے ہیں" ہم نے اسوقت خروج کیا جب ہم کو خوف ہو گیا کہ آسمان سے ہم پر پتھر برسیں گے" انہ کان رجلا ینکح الاخوات والامھات الاولاد جبوقت دنیا کی ذہنیت تبدیل ہو گئی۔ اور اسلام کے خط و خال مٹ چکے تھے جبوقت ذمہ دار اشخاص اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے جبوقت کوئی اعتراض کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اسوقت اگر رسول کا فرزند اگر اسلام کا ایک ذمہ دار رہنما یعنی حسینؑ ابن علیؑ۔ یزید کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا تو یاد رکھو کہ دنیا میں پھر اسلام کی تصویر نہ دکھائی دیتی۔ دنیا میں پھر اسلام کے احکام کا نام لیوا دکھائی نہ دیتا اسکے معنی کیا ہیں؟ اسکے معنی یہ ہیں کہ امت مرحومہ جو رسولؐ کے قول کے مطابق نجات کی مستحق تھی وہ جا رہی تھی ہلاکت ابدی کے راستے پر۔ لیکن حسینؑ نے اپنی جان دے کر حقانیت کو ظاہر کیا اور دنیا کو بتایا کہ سلطنت اور ہے اور طاعت باری اور ہے۔ دنیا کچھ اور ہے۔ دین

کچھ اور ہے حق اور ہے باطل اور ہے۔ دنیا کی آنکھیں کھولدیں دنیا کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹا دیے۔ اس طرح اسلام حسینؑ کی بدولت قائم رہا حسینؑ ہماری نجات کے باعث ہوے۔ اُمت رسولؐ کی نجات کے باعث ہوے لیکن اسکے کیا معنی؟ اسکے یہ معنی ہیں کہ حسینؑ نے نجات کا راستا نمایاں کر دیا۔ نجات کا ذریعہ بنا دیا۔ نجات کی صورت نمایاں کردی۔ اس طرح حسینؑ نجات دہندہ اُمت ہیں۔ یعنی حسینؑ نے ایک امت کی تشکیل کی جو اپنے عمل سے نجات کی مستحق ثابت ہو اور اس لئے درحقیقت ہم حسینؑ کے وجود کو نشاۃ ثانیہ اسلام کا باعث سمجھتے ہیں یعنی اگر رسولؐ نے اسلام کو قائم کیا۔ تو حسینؑ نے اسلام کو دوسرا وجود دیا حسینؑ نجات دہندہ ہیں یعنی اگر حسینؑ نہ ہوتے۔ اور اُن کا طرز عمل نہ ہوتا۔ تو ہم نجات کے مستحق نہ ہوتے یعنی ہم وہ عمل ہی نہ کرتے جو سبب نجات قرار پاسکیں۔ ہم اُس راستے ہی پر نہ چلتے جو نجات کا باعث ہو سکتا ہے حسینؑ نے اپنے طرز عمل سے ہمکو نجات کا مستحق بنا دیا۔ ہمیں ایسے طریقوں پر کاربند بنا دیا کہ ہم اپنے عمل سے نجات کے مستحق ہوے اس طرح سے حسینؑ نجات دہندہ ہیں۔ اس طرح نہیں جس طرح عیسائیوں کے مسیح نے گناہوں کا راستا کھولدیا۔ ہمارا مظلوم شہید تو اطاعت کے راستے پر لیجانے والا تھا۔ گناہوں کا دروازہ کھولنے والا نہیں تھا۔

ان معنوں میں حسینؑ نجات دہندہ تھے حسینؑ نے ہمارے قوائے عملی کو معطل نہیں کیا۔ درحقیقت گریہ و بکا کا حکم دیا گیا ہے۔ اسکے جتنے بہتر سے بہتر ثواب مقرر کیے گئے ہیں۔ اگر گریہ و بکا کا ثواب ہمارے سامنے ہو گا تو ہم اُنکے حالات کو زیادہ پیش نظر رکھنے پر آمادہ ہونگے اس کا یہ اثر ہو گا کہ ہمارے اعمال پر اُن کا اثر پڑے۔ ورنہ یاد رکھیے۔ اگر اتنی اہمیت اس واقعہ کو بحیثیت مصیبت نہ دیگئی ہوتی۔ تو دنیا کے تمام واقعات کی طرح یہ بھی تاریخی کتابوں کے سپرد ہو جاتا۔ اور یہ جو ہمارا بچہ بچہ اس واقعہ سے واقف ہے۔ یہ کبھی نہ ہوتا۔ آج ہم اس سے واقف ہی نہ ہوتے تو سبق کیا حاصل کرتے؟ لیکن یہ دعوت مصیبت سے اثر لینے کی طرف! گریہ کی طرف! یہ تو مقتضائے فطرت ہے۔ اسکو خاص طور سے قائم کرنے کی دعوت اسلئے تھی کہ واقعات بھولنے نہ پائیں تاکہ اس واقعہ کے اصلی مفاد جو ہیں وہ محفوظ رہیں۔ اس واقعہ کا اصلی مقصد جو ہے وہ قائم رہے۔ اور عملی ترقی زیاد سے زیادہ پیدا ہوتی رہے۔ چھوٹے چھوٹے جزئی واقعات جن کا واقعہ کربلا ایک مجموعہ ہے۔ وہ حقیقی تعلیم اسلام ہے یعنی ہر عمل میں کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے تعلیم کا۔ واقعہ کربلا باوجود اپنی مختصر مدت کے باوجود اپنے محدود وقت کے تمام اہم تعلیمات اسلام کا مرکز تھا۔ ہر قسم کی عملی تعلیم۔ حق اللہ سے متعلق حق الناس سے

متعلق، تربیت منزل سے متعلق۔ معیار ملک وسلطنت سے متعلق۔ تمدن سے متعلق۔ اجتماعی وانفرادی زندگی سے متعلق۔ شرائط محبت سے متعلق تمام اخلاقی۔ علمی۔ عملی تعلیمات سب کے سب واقعہ کربلا میں مضمر ہیں۔ اسلئے اس واقعہ کے چھوٹے چھوٹے جزئیات بھی وہ اہمیت رکھتے تھے جنکو ہم تک پہونچانا ضروری تھا۔ درحقیقت اسلامی نقطہ نظر سے (اور میں اپنے عقیدہ کی بنا پر بھی) کہتا ہوں۔ کہ ہم امام حسینؑ کو صرف اس بنا پر دوست نہیں رکھتے اور مستحق تعظیم نہیں سمجھتے کہ وہ رسولؐ کے نواسے تھے۔ رسالتمآبؐ نے بھی کبھی ان افراد کو صرف اس وجہ سے دوست نہیں رکھا کہ وہ آپ سے نسبت اور رشتہ داری رکھتے تھے۔ یہ کہنا۔ درحقیقت رسولؐ کی روحانی شخصیت پر الزام لگانا ہے۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ جو کچھ آپ نے اپنے اہلبیت کے ساتھ کیا وہ رشتہ داری کا نتیجہ تھا۔ ہم امیر المومنینؑ کو اسلئے دوست نہیں رکھتے کہ وہ داماد تھے۔ یا چچازاد بھائی تھے۔ ہم حضرت سیدہ عالم کو اسلئے دوست نہیں رکھتے کہ وہ حضرت کی صاحبزادی تھیں درحقیقت رسولؐ نے جو کچھ ان حضرات کا پاس کیا۔ وہ اسلئے تھا کہ آپ کے اخلاق اور آپکے کمالات کی یہ افراد سچی تصویر تھے۔ ہم ان افراد کے لئے شرط عقیدت اسلئے ادا کرتے ہیں کہ وہ عملی حیثیت سے ہمارے مقتدا ہونے کے قابل تھے۔ ہم نے کبھی شرائط امامت میں رشتہ داری کو نہیں رکھا ہے۔

یہ اتفاق کی بات ہے کہ وہ افراد جو معصوم تھے وہ حضرت کی اولاد میں سے تھے یا حضرتؐ کے داماد تھے۔ لیکن ہم نے شرائط امامت میں یہ نہیں قرار دیا ہے کہ حضرتؐ کا داماد ہو یا اولاد میں سے ہو۔

جتنی اہمیت واقعہ کربلا کو دی گئی وہ نہ صرف اسلئے کہ رسولؐ کی طرف انتساب رکھنے والی ہستیاں تھیں۔ بلکہ درحقیقت اسلئے کہ اسلام کے سچے مجسمے جو تھے ان کو مسلمانوں کی تلواروں نے تہ تیغ کیا۔ واقعہ کربلا کی زیادہ سے زیادہ تبلیغ بھی اس حیثیت سے نہیں ہوئی کہ وہ ایک دردانگیز مصیبت تھی۔ بلکہ اسلئے ہے کہ جس مقصد کے لئے ہوئی تھی اس سے ہم روشناس ہو سکیں بے شک رونے کا حکم دیا گیا اس کا مقصد خود اس حکم میں مضمر ہے، گریہ و بکا خاص طور سے رضائے الٰہی کا سبب ہے۔ اور وہ حکم ہے جو مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن اسلام کا مقصد اس سے جو تھا وہ ہماری عملی اصلاح تھی، ہم نے اس مقصد کو بھلا دیا اور اپنے پیش نظر نہیں رکھا اس میں اسلام کا قصور نہیں ہے۔

اسلام میں عمل کی اہمیت

دنیا اسلام کے خلاف یہ غلط دعویٰ کرنے کی جرأت کرتی ہے کہ اسلام نے دنیا کو عمل کی تعلیم نہیں دی ہے۔ بلکہ انسان کے قوائے عمل کو معطل رکھا ہے لیکن یا تو یہ اُن لوگوں کی بے خبری ہے یا واقعی ہٹ دھرمی اور تعصب ہے جب اسلام کے خلاف کوئی اعتراض نہیں ملتا تو یہ اعتراض ڈھالا جاتا ہے۔

درحقیقت اسلام سے بڑھکر کوئی مذہب نہیں ہے جس نے عمل کو معیار قرار دیا ہو اگر آپ قرآن کی ورق گردانی کیجئے تو آپ ملاحظہ کیجئے گا کہ جہاں جہاں نجات کا ذکر کیا گیا ہے وہاں عمل صالح کو داخل کر دیا ہے۔ ان الذین امنوا و عملو الصالحات طوبیٰ لھم و حسن مآب " وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کئے ہیں اُنکے لئے بہترین بازگشت ہے۔ ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب و یقیمون الصلوٰۃ ومما رزقناھم ینفقون۔ اس کتاب قرآن میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ یہ ہدایت ہے اُس جماعت کے لئے جو خدا سے ڈرنے والی ہے۔ جو غیب پر ایمان لاتی ہے اور نماز پڑھتی ہے اور زکوٰۃ ادا کرتی ہے "

اسمیں جہاں ایمان کے طرف اشارہ ہے وہاں اسکے ساتھ ساتھ

صلوٰۃ کا بھی تذکرہ ہے زکوٰۃ کا بھی تذکرہ ہے۔ قرآن میں کوئی ایک موقع بھی ایسا نہیں ہے جہاں عمل کو بلا ضرورت ثابت کیا ہو۔ اور عمل سے کنارہ کشی کی اجازت دی ہو۔ ہر چیز عمل پر موقوف قرار دی۔ درحقیقت ایک کلیہ دنیا کے سامنے پیش کیا کل نفس بما کسبت رھینۃ۔ "لبس انسان اپنی کوشش کا رہین منت ہو جتنی کوشش کرے گا وہ کوشش اسکے سامنے آئے گی" لیس للانسان الا ما سعی وان سعیہ سوف یری ثم یجزیہ الجزآء الاوفی وان الی ربک المنتھی انسان کیلئے وہی ہے جو اس نے کوشش کی اور اسکی کارگذاری دیکھی جائے گی پھر اسکو پوری جزا دیجائے گی۔ آخر میں تو اسے خدا ہی کے سامنے جانا ہے، خدا ہی کے سامنے اسے پیش ہونا ہے" لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت انسان کا نفس جو کچھ وہ حاصل کرے گا وہی اسکے کام آیگا جو کچھ اپنے ہاتھ سے اپنے لئے وہ کر رکھے گا۔ وہی اسکے خلاف پیش کیا جائے گا درحقیقت ثواب بھی عمل کا نتیجہ ہے۔ اور عقاب بھی عمل ہی کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنا ہی حاصل کیا ہوا ذخیرہ ہوگا اور اپنا ہی کھودا ہوا کنواں۔ اپنی روشن کی ہوئی آگ ہوگی جو روز قیامت اسکے سامنے پیش ہوگی۔ وہ کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ انسان کے عمل ہیں جو بھیس بدل کر سامنے آجاتے ہیں۔ وہ وہی یہاں کے اعمال ہونگے جو صورت ثواب وعقاب میں پیش

ہوں گے - اچھے عمل کئے - صورت نیک سامنے آئی بُرے عمل کئے صورت بری حاصل ہوئی الدنیا مزرعۃ الاخرۃ دنیا کھیتی ہے آخرت کی - اسکے کیا معنی ہیں ؟ اسکے یہ معنی ہیں کہ بیج جو آپ بوتے ہیں - درحقیقت اُسمیں ایک دنیا مضمر ہے اُس تمام کاشت کی جو آپ کے سامنے آئے گی اسی طرح عمل صالح ایک تخم زراعت ہے جو زمین اخلاص میں بویا جاتا ہے جس طرح سے دانہ زمین میں بویا اور خاک کے پردہ میں نہاں ہو گیا - آپ کو خبر نہیں ہے کہ زمین کے پردوں میں کیا ہو رہا ہے - درحقیقت وہ ضایع نہیں ہو گیا - وہ خزانوں میں محفوظ ہے - وہ جتنا بویا گیا ہے اُس سے زیادہ ہو کر ملے گا - اسی طرح انسان نے عمل کیا - اور دامن زمانہ اُسے اپنے ساتھ لیتا گیا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا مگر زمین نشو و نما دینے والی تھی آپ کا عمل یہاں جو ایک دانہ کی شکل رکھتا تھا وہاں اس میں پھیلاؤ پیدا ہو گیا - کم از کم وہ چند ہوا من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا اور زیادہ سے زیادہ اُس کو خدا جانے - ایک حبہ ہو اور اُس سے سات بالیاں پیدا ہوں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں مثال یہ اُس عمل کی ہے جس میں افزائش پیدا ہو -

انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی

اسلام کے معتدل قوانین

دنیا نے انسانی زندگی کے لئے جو لائحہ عمل تیار کیا۔ اسمیں مختلف نظریے کارفرما نظر آتے ہیں بعض لوگوں نے انسانی حیثیت کو اسی موجودہ دنیا میں محدود سمجھکر صرف اسی دنیا کی اچھائی اور خیر و برکت کو پیش نظر رکھا۔ انھوں نے اپنا نقطہ نظر یہ قرار دیا کہ اس دنیا میں رہو سہو راحت و آرام اٹھالو۔ اسکے بعد کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ بے شک اگر انسان کی زندگی اسطرح محدود ہے کہ اس کی ابتدا وقت ولادت سے ہوئی ہے۔ اور انتہا دنیا سے رخصت ہونے پر ہوتی ہے۔ تو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اسوقت انسان کا مقصد زندگی یہی موجودہ زندگی ہونا چاہیئے۔ اور یہ موجودہ زندگی بہتر سے بہتر طریقہ سے گذاری جائے اسی کو نصب العین ہونا چاہیئے۔ کسی نے آخرت کا خیال اپنے پیش نظر کیا اور اس حد تک کہ موجودہ دنیا کی ضرورت کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے موجودہ دنیا کی حیات کو کوئی چیز ہی نہیں سمجھا۔ بلکہ جو کچھ بھی اہمیت دی وہ صرف آخرت کی زندگی کو یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے انسان کے لئے اسے عبادت قرار دیا کہ انسان

تمام دنیا سے بددل ہو کر تمام رشتوں کو توڑ کر پہاڑوں پر جاکر تنہائی میں زندگی بسر کرے سخت ترین تکلیفوں کے ساتھ اپنے نفس کو ایذا پہنچائے اس ایذائے نفسانی کو آخرت کی کامیابی کا ذریعہ سمجھا۔ آپ دیکھیے گا تو آپ کے ارباب وطن یعنی ہندوؤں کے بہت سے فرقوں میں اس قسم کی عبادتیں آپ کو ملینگی۔ جو صرف ایذائے نفسانی پر مبنی ہیں۔ آپ کو ملیں گے ایسے افراد جو خدا کی خوشنودی کے لئے۔ اپنے ہاتھ اٹھا دیتے ہیں اور اسی حالت پر باقی رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ خشک ہو جائیں۔ اس سے وہ خدا کی رضامندی کے طالب ہوتے ہیں۔ آپ کو ایسے افراد ملیں گے۔ جو آب و غذا ترک کر دیتے ہیں۔ اس حد تک کہ بالکل ضروریات زندگی سے بے کار و معطل ہو جائیں اور اس سے وہ صرف خدا کی رضامندی کے طالب ہوتے ہیں۔ میں نے ایک عربی اخبار میں جو مصر سے نکلتا ہے ایک تصویر دیکھی۔ ایک شخص نے ایک تخت میں میخیں، گاڑ رکھی ہیں۔ اُن پر وہ پاؤں رکھکر بیٹھا ہوا ہے۔ تاکہ وہ اُسکے پیروں میں چبھیں۔ اور خدا کی رضامندی کا باعث ہو۔ ایسے بھی لوگ ملیں گے جو مندروں میں جاکر بچوں کو ذبح کرتے ہیں اور اس سے وہ خدا کی رضامندی کے طالب ہوتے ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ عورتوں کے لئے سبب رضائے خدا قرار دیا گیا ہے کہ مرد کے مرنے کے بعد اپنے تئیں نذر شعلۂ آتش کر دیں

اور اس طرح خدا کی رضامندی حاصل کریں۔

عیسائیت کی تعلیم اسوقت بھی انجیل کے صفحات پر موجود ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص ملکوت آسمان میں داخل نہیں ہو سکتا جس کی شادی ہوگئی ہو۔ کوئی شخص ملکوت آسمان میں داخل نہیں ہو سکتا جس نے ایک وقت کھایا ہو۔ اور دوسرے وقت کے لئے گھر میں رکھا ہو کہ صبح کو کھائینگے

ان لوگوں نے درحقیقت عالم کائنات کی تصویر کے ایک ہی رخ پر نظر کی آخرت ہی کو دیکھا۔ اور آخرت ہی کو اپنے پیش نظر کیا مگر اس موجودہ دنیا کو اسقدر بے حقیقت سمجھ لیا اور اسقدر بے وقعت قرار دے لیا کہ گویا خدا نے انسان کے لئے موجودہ زندگی جو قرار دیا ہے وہ بالکل عبث اور بیکار ہے۔ اگر موجودہ دور زندگی درحقیقت کوئی قابل اعتبار چیز نہیں تھی تو قدرت نے انسان کے لئے یہ دور زندگی قرار ہی کیوں دیا۔ انسان کے لئے یہ زندگی عطا کیوں کی۔ خدا کی ہر نعمت اسوقت تک جب تک کہ وہ نعمت ہے۔ قابل قدر حیثیت رکھتی ہے۔ خدا کا کوئی کام عبث اور بیکار نہیں ہوتا۔ اسنے ہمکو یہ دور زندگی عطا کیا۔ اگر ہمکو مارنا ہی منظور تھا تو پھر زندگی عطا کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ اب آپ ملاحظہ فرمائیے کہ تعلیم وہی درحقیقت کامیاب تعلیم کہی جا سکتی ہے جو مفاد قدرت کو پورا کرنے والی ہو وہی تعلیم کامیاب ہو سکتی ہے جو نوع کو باقی رکھنے والی ہو۔ لیکن اگر تعلیم اسمیں

اگر اس تعلیم پر عمل کرنے سے نوع انسانی ہی فنا ہو جائے تو ایسی تعلیم کبھی
کامیاب تعلیم نہیں کہی جاسکتی۔ اگر دنیا حقیقی طور سے پابندی اختیار کرے
انجیل کی تعلیم کی یعنی انجیل کی تعلیم کے مطابق ہر شخص شادی کرنا موقوف
کر دے۔ ہر شخص جنگل میں نکل جائے۔ پہاڑوں کے غاروں میں خدا کی عبادت
میں مصروف ہو جائے۔ تو چند روز میں نسل انسانی ہی باقی نہ رہے گی
نوع بشری ہی ختم ہو جائے گی۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ سلسلہ کائنات
جس کو خدا نے اشرف المخلوقات قرار دیا تھا اس کا نقش ہی مٹ جائیگا
بھلا خدا اپنی طرف سے ایسی تعلیم کب دیگا جو خود اسکے مفاد ایجاد کے خلاف
ہو؟ ایسی تعلیم کبھی خدائی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ یعنی ہم ایک دن کے لئے بھی
خدا کی طرف منسوب کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ اُس نے ایسی تعلیم دی ہو
جس سے نسل انسانی فنا کے قریب ہو جائے! حقیقتاً کامیاب تعلیم وہی
کہی جاسکتی ہے جو انسانی زندگی کو موجود رکھتے ہوئے نسل انسانی کو
باقی رکھنے کی صورتیں پیدا کرتی ہو۔ اور آخرت کے اوپر توجہ بھی قائم رکھے
یہی وہ تعلیم ہو سکتی ہے جو نوع انسانی کی صحیح طور سے رہنما ہو سکتی ہے اسکا
یہ نتیجہ ہو گا کہ وہ تعلیم کبھی ممنوع العمل نہو گی۔ جو تعلیم عیسائیوں نے دی۔
اُسکے متعلق جب خود عیسائی عمل کر کے دکھالیں تب اُن کو حق ہو گا کہ ہمارے
سامنے پیش کریں۔ میں کہتا ہوں کہ ایک سال عیسائی دنیا۔ اسپر عمل کر کے

جو اُن کی انجیل میں مذکور ہے پھر ہم کو دعوت دے کہ ہم بھی اسپر عمل کریں ہم جانتے ہیں کہ اسوقت اپنی اپنی مردم شماری کو زیادہ کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ آج اگر عیسائیوں کی تعلیم پر عمل ہو جائے تو دنیا ختم ہو جائے۔ سیاست منقلب ہو جائے۔ حکومت فنا ہو جائے عیسائیوں کی تعلیم اسوقت جب خود عیسائیوں کے لئے غیر ممکن العمل ہے تو انھیں حق کیا ہے کہ دنیا کے سامنے پیش کر کے دعوت عمل دیں۔ یہ مسلمانوں کو فخر ہے کہ اُن کی تعلیم اتنی جامع ہے۔ اور اتنی منشا قدرت کے مطابق ہے کہ اگر وہ دنیا کے سامنے پیش کریں تو اُن میں کا ہر فرد اسکا دعویٰ کر سکتا ہے کہ "میں اسپر عمل کر سکتا ہوں اسلئے تم کو دعوت دیتا ہوں"۔ یہ جو دنیا اور آخرت میں تفریق کر دی تھی کہ کسی نے دنیا کو سب کچھ سمجھا۔ اور آخرت کو کچھ نہیں سمجھا۔ اور کسی نے آخرت کو سمجھا اور دنیا کو کچھ نہ سمجھا۔ اسلام نے آکر نقطۂ اعتدال پیش کیا کہ ہم نے جو تمھارے لئے موجودہ زندگی کو قرار دیا ہے تو اس سے فائدہ اُٹھانے کو ناجائز نہیں قرار دیا۔ اُس نے موجودہ زندگی کو محترم قرار دیا۔ اُس نے موجودہ زندگی کو ایک عزت دار چیز قرار دیا۔ یہانتک کہ خود انسان اگر کسی وقت اپنے نفس کو وقتی جذبات سے مجبور ہو کر ہلاکت میں ڈالنے کو تیار ہو جائے تو وہ روکتا ہے۔ "لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ" خبردار! اپنے نفس کو ہلاکت میں نہ ڈالنا۔ اسلئے کہ وہ ہمارے نفس پر ہم سے

زیادہ حقدار ہے۔ ہمیں اپنے نفس کی کیا قدر؟ اُسے قدر ہے جو درحقیقت
اس نقش کا نقاش ہے اور یہ فطرت کا تعلق ہے کہ جو چیز کسی شخص کو بغیر
محنت و مشقت کے ملجاتی ہے اسکی کبھی قدر نہیں ہوتی۔ ہماری دولتیں
کس طرح ہمارے ہاتھ سے گئیں؟ باپ دادا کی کمائی ہوئی تھیں۔ ہم نے
محنت نہیں کی تھی۔ ہم نے قدر بھی نہیں کی انھوں نے اپنا خون پسینہ ایک
کر کے حاصل کیا تھا۔ اُسکو پانی کی طرح ہم نے بہا دیا۔ اسلئے کہ ہمیں اُسکی
قدر نہ تھی۔ اسی طرح نفس کا وجود۔ انسان کو اسکی کیا قدر؟ کسی اور کا
عطیہ ہے۔ انسان کو نعمت وجود عطا کر دی گئی ہے۔ انسان ہر وقتی جذبہ
سے متاثر ہو کر اس وجود کو فنا کرنا چاہتا ہے لیکن وہ جو قدر شناس ہے۔
اُسکو وہ روکتا ہے۔ خبردار! تجھے کیا حق ہے کہ اس زندگی کو فنا کر دے
میں نے یہ زندگی قرار دی ہے۔ مجھے حق ہے۔ اُس نے انسانی زندگی
کو محترم قرار دیا۔ قتل نفس کو بڑے سے بڑا گناہ قرار دیا۔ شرک کا مرادف
قرار دیا۔ دوسروں کے نفس کو محترم بنایا اپنے نفس کو محترم بنایا۔ اپنے
خاص عزیز رشتہ دار یہانتک کہ اپنی اولاد تک کو قتل کرانے کا حق نہیں
دیا۔ وہ مشرکین قریش تھے جو اپنی اولاد کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ اپنی
لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ اس ڈر سے کہ اگر زندہ رہیں تو سامان
زندگی کہاں سے آئیگا ممکن ہے کہ ذلت کی کوئی بات ہو جائے۔ اسلئے

قتل کر دیا کرتے تھے مگر منع کیا گیا ارشاد ہوا۔ لا تقتلوا اولادکم خشیۃ
املاق نحن نرزقکم وایاھم۔ اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف
سے قتل نہ کیا کرو۔ آخر تم کو بھی ہم ہی رزق دیتے ہیں اُن کو بھی ہم ہی دینگے
لیکن یاد رہے کہ تاریخ اپنے تئیں پلٹا یا کرتی ہے۔ دنیا پچھلے پاؤں جا رہی
ہے جس طرح سے وہ جہالت کا دور دورہ تھا جبوقت ہر طرف ظلمت
چھائی ہوئی تھی۔ اُسوقت اولاد کو قتل کیا جاتا تھا۔ وہی طریقے اب بھی
جاری ہو رہے ہیں۔ وہی راستے اب بھی کھولے جا رہے ہیں۔ فرق
صرف اتنا ہے کہ پرانی بد تہذیبیوں کو اچھائیوں کا بھیس پہنا دیا گیا ہے
پرانے زمانہ میں اگر اولاد کو قتل کیا جاتا تھا۔ تو اب ایسی صورتیں اختیار
کی جا رہی ہیں کہ آنے والا نفس دنیا میں آنے ہی نہ پائے اور قتل کر دیا
جائے نتیجہ میں دونوں ایک ہیں۔ نقطۂ نگاہ متحد ہے۔ اسکے معنی یہ
ہیں کہ ذہنیت ملتی جلتی ہوئی ہے۔ ہم اپنے نزدیک سمجھ رہے ہیں کہ
فکروں میں روشنی پیدا ہو رہی ہے۔ انسانیت ترقی کر رہی ہے لیکن
ترقی کا اصل نقطہ ہم سے بہت دور ہے جس کو ہم ترقی سمجھ رہے ہیں وہ
حقیقتاً تنزل ہے۔ طرز عمل مختلف ہے لیکن جب نقطہ نگاہ ایک ہوا تو
حقیقتاً عمل متحد ہے۔ وہ اقتصادی مشکلات سے ڈر کر قتل کرتے تھے۔
اب والے بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ پھر وہ اکثر ایک جذبہ غیرت کے تحت میں

لڑکیوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے تھے۔ ہمیں ایک قابل تعریف جذبہ شریک تھا۔ چاہے حد اعتدال سے بڑھنے کے باعث مورد مذمت ہو جائے۔ مگر آجکل کی دنیا ایسی ہو گئی کہ لڑکیوں کو ہی نہیں بلکہ لڑکوں کو بھی فنا کرتے ہیں۔ یہ ایک نظریہ کی غلطی ہے۔ بہت بڑی۔ اُنکے نقطۂ نظر میں اور اِنکے نقطۂ نظر میں اتنا فرق ہے کہ وہ ڈر کے لحاظ سے خوف فقر و فاقہ کے لحاظ سے صرف اُس عنصر کو فنا کرتے تھے جس سے عار و ننگ کا خوف تھا۔ لیکن اس عنصر کو جو کارآمد ہو سکتا تھا۔ باقی رکھتے تھے۔ مگر آج کی دنیا کی یہ عقلمندی ہے کہ جس طرح سے کمزور صنف کو فنا کرتے ہیں اسی طرح طاقتور صنف کو بھی جس سے درحقیقت دنیا کا نظام قائم ہے۔ جو درحقیقت منافع کی حاصل کرنے والی ہے جسکے معنی ہیں افراد کا سبب۔ اُسکو بھی دنیا سپرد خاک کر رہی ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ اُن کا طرز عمل اُنکے طرز عمل کی نسبت حکیمانہ تھا۔ کیونکہ ولادت کے قبل ذکور اور اُناث کی تفریق ہو نہیں سکتی انھوں نے جو انسانی ہستیوں کے فنا کرنے کا طریقہ قرار دیا ہے اُس میں سب فنا ہو جاتے ہیں۔

بہرحال اسلام دونوں کا مخالف ہے اسلام یہ کہتا ہے کہ جو نقش صفحہ قرطاس پر آ گئے وہ وجود کا حقدار ہے۔ اور جو نقش بنے وہ باقی رہنے کے قابل ہے۔ اسلئے کہ نقاش کا قلم غلطی نہیں کرتا۔ مٹا دینے کے قابل ہے

وہ جو حرف غلط کی حیثیت رکھتا ہو۔ جسکے قلم کی گردش نقطہ صحت پر ہو
وہ کبھی مٹانے کے قابل نہیں۔ اسکی بقا میں حکمت ہے۔ جب وہی چاہے
تب فنا کرے۔ ہمکو یہ حق نہیں ہے کہ اسکی کسی مخلوق کے فنا کا باعث
قرار پائیں۔ اسلام نے دنیا کے سامنے یہ نظریہ پیش کیا کہ موجودہ زندگی
قابل احترام ہے۔ مگر موجودہ زندگی کو صرف ایسے طریقہ سے صرف کرو کہ
یہ زندگی پیش خیمہ قرار پائے آئندہ زندگی کا۔ یہ زندگی تمہید عمل قرار پائے
حیات آخرت کی۔ ہم نے دنیا کی مذمت ضرور دیکھی ہے۔ لیکن یاد رکھئے
مذمت "الحیٰوۃ الدّنیا" کی ہے۔

"الحیٰوۃ الدّنیا" ذرا عربی داں طبقہ سے دریافت کر لیجئے۔
اپنے اپنے محل پر اس کے معنی کیا ہیں؟ اسکے معنی ہیں وہ زندگی جو پست
درجہ رکھتی ہے۔ حیٰوۃ الدّنیا مضاف الیہ کی ترکیب کے ساتھ
اُسکے معنی ہوے اس نشاۃ دنیا کی زندگی لیکن ایسا نہیں ہے
بلکہ "الحیاۃ الدّنیا" وہ زندگی جو پست درجہ رکھتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ
زندگی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ زندگی جو پست درجہ رکھتی ہے۔
"الحیٰوۃ الدّنیا" جو قابل مذمت ہے اور ایک وہ زندگی جو بلند درجہ
رکھتی ہے۔ جو علو مرتبہ رکھتی ہے۔ وہ زندگی قابل مذمت نہیں ہے
یہ مذمتیں جو کچھ ہیں وہ "الحیٰوۃ الدّنیا" کی ہیں۔ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ

تم اس دنیا میں اس طرح زندگی گذارو کہ وہ "الحیوٰۃ الدنیا" رہے ہی نہیں۔ بلکہ وہ دنیا درحقیقت دین بنجائے۔ وہ دنیا درحقیقت منزل آخرت بنجائے۔ یہ اُس دنیا کی مذمت ہے جس کا طرز زندگی انسان کی پست ذہنیت کا قرار دیا ہوا ہو یہی وہ ہے جسے درحقیقت "الحیوٰۃ الدنیا" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اصل دنیا کی زندگی؟ وہ تو اگر ہوتی تو آخرت کی منزل ہی نہ آتی۔ وہ دنیا کی زندگی وہی ہے جس سے انبیاء و مرسلین مستثنیٰ نہیں رہے۔ وہ زندگی درحقیقت سرچشمہ ہے تمام خیرات و برکات کا وہ زندگی وہ ہے جس پر شکر کیا ہے شکر کرنے والوں نے جس وقت کوئی جنازہ آپ کی نظر سے گذرے تو آپ کیلئے مستحب ہے کہ آہستہ سے اپنے دل میں یہ دعا پڑھیے۔ الحمد للہ الذی لم یجعلنی من السواد المخترم شکر ہے اُس خدا کا جس نے مجھکو اس جماعت میں سے قرار نہیں دیا۔ جو مردہ ہوے ہیں۔

لوگوں کو اس کے معنی سمجھنے میں دشواری ہوئی ہے بعض نے کہا کہ فنا ہونے کے معنی ہلاکت ابدی میں مبتلا ہونے کے ہیں لیکن موقع و محل کے لحاظ سے اس معنی سے کوئی تعلق نہیں ہے معنی وہی ہیں کہ شکر ہے کہ مجھ سے نعمت زندگی سلب نہیں ہوئی ہے۔

یقیناً خدا کا ہر کام اُسکے محل پر موجب شکر ہے جبتک زندگی ہے

زندگی قابل شکر ہے۔ اگر موت آجاتی تو موت قابل شکر ہوتی۔
جبتک زندگی ہے خدا کی طرف سے وہ انسان کے لئے بہتر سے بہتر
نعمت ہے۔ لا رھبانیۃ فی الاسلام اسلام میں رہبانیت نہیں ہے
اس عبادت کو اسلام نے مستحسن نہیں قرار دیا کہ تمام نوع انسان سے
علیحدہ ہو کر خدا کی عبادت کی جائے۔ اسے کوئی چیز نہیں سمجھا۔ عیسائیت
کی وہ تعلیم کہ خدا کے ملکوت میں وہ داخل نہ ہوگا جو شادی کرلے۔ اسلام نے
یہ کہا کہ "ہماری جماعت سے وہ نہیں ہے جو شادی نہ کرے۔" یعنی جو
پابند ہو اپنی شادی نہ کرنے کا وہ ہماری جماعت سے خارج ہے۔

اس طرح ثابت کیا کہ اسلام وہ ہے جو نوع انسان کے بقا کا ذمہ دار
ہو کر آیا ہے۔ فنا کا نہیں۔ مٹانے کا نہیں۔ وہ تعلیم کہ جس نے ایک وقت
کھایا اور دوسرے وقت کے لئے اٹھا کر رکھ دیا وہ ملکوت آسمان میں
داخل نہیں ہو سکتا۔ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے۔ اسلام بے شک مال و دولت
کو خزانوں میں رکھنے کے مخالف ہے۔ اسلام یقیناً سرمایہ داری کے اس
معنی میں مخالف ہے کہ تمام دولتوں کو سمیٹ کر خزانوں میں رکھا
جائے۔ اسلام کے نقطۂ نظر میں مال و دولت فائدہ اٹھانے کے لئے
ہے۔ اسلئے نہیں ہے کہ اسکو صرف دیکھ لیا جائے اور اسکے ہونے سے
دل خوش کر لیا جائے۔

اس سرمایہ داری کے اسلام خلاف ہے۔ اسکی وجہ کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ
اسلام انفرادی زندگی سے زیادہ اجتماعی زندگی کا حامی ہے مین نے انفرادی
زندگی کے متعلق عرض کیا کہ اسلام نے اُسکو محترم قرار دیا۔ یہانتک کہ انسان
کے لئے خود اپنے نفس کو ہلاکت مین ڈالنا ناجائز قرار دیا۔ لیکن اجتماعی
زندگی اسقدر محترم قرار دی۔ کہ یہ انفرادی زندگی جسکے لئے وہ خاص
خاص اوقات مین اپنے فرائض تک کو اُٹھا لیتا ہے۔ یعنی نفس کو اگر
کسی نقصان کا خوف ہے تو وہ اپنے حکم کو آپ برطرف کر لیتا ہے۔ آپ
ملاحظہ کیجئے کہ وضو کا حکم ہے نماز بغیر وضو کے صحیح نہین ہے۔ اگر خدانخواستہ
کوئی مرض ہے قدرت کی طرف سے حکم ہے کہ وضو نہ کرے تیمم کرلے۔ اسطرح
یہ بتایا کہ انسانی زندگی اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ ہم اپنی ذاتی عبادت
بدل دیتے ہین تمھاری زندگی کی حفاظت کیلئے۔ وہ مرض بھی کوئی ایسا
مرض نہین جو لاعلاج ہو۔ ایسا بھی نہین کہ سخت دشوار ہو امراض مزمنہ
نہین جنکا علاج ممکن نہ ہو۔ معمولی سی تکلیف جو مرض سمجھی جاسکے۔ اسکو
بھی قدرت نہین گوارا کرتی۔ سفر مین انسان کی طبیعت پر دشواری
ہوتی ہے۔ یہ خیال نہ کیجئے کہ سابقہ زمانہ کا سفر اس مین صعوبتین تھین
بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود سفر کے مفہوم مین ایک گرانی داخل ہے۔
انسانی فطرت ہے یعنی آپ انتہا سے زیادہ رحت کے ساتھ سکنڈ کلاس

مین فرسٹ کلاس مین سفر کیجئے۔ جو بات گھر مین ہے وہ سفر مین نہین مہیا [?]
ہو گی۔ اسی فطرت انسانی کی نباضی کرتے ہوئے قدرت کی طرف سے
نمازین نصف کر دی گئین۔ حکم دیا کہ اگر سفر مین جاتے ہو تو ہم تم سے
چار رکعتون کے بجائے دو ہی قبول کرینگے۔ یونہی روزے بلا عذر
نہین چھوڑے جا سکتے تھے۔ سفر مین چھوڑ دو پھر کبھی رکھ لینا۔
اس طرح سے تبلایا کہ تمھاری جسمانی زندگی کہان تک ہم کو عزیزی [?]
اس طرح تمام اُن غلطیون کا سد باب کیا جو درحقیقت خدا کی رضامندی
کو انسان کی ایذائے نفس مین منحصر قرار دیتی تھین۔ وہ دنیا کا نظریہ کہ جتنا
ہم اپنے نفس کو خواہ مخواہ کی تکلیف دینگے اُتنا ہی خدا ہم سے رضامند ہوگا [?]
اسلام نے غلط ثابت کیا۔ اُس نے ہمارے لئے ہر طرح کی آسانیان
قرار دین۔ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" خدا
تمھارے لئے آسانی چاہتا ہے مشکل مین ڈالنا نہین چاہتا" اُس نے
اسی نوعیت کے قوانین قرار دیے کہ کوئی حکم شرعی بلا استثنا ہماری طرف
سے اُس مین دشواریان اور اعذار پیدا ہو جائین تو ہم اُس حکم کو برطرف
کر دینگے۔ "ما جعل اللہ علیکم فی الدین من حرج" تمھارے
لئے مذہبی احکام مین عسر و حرج نہین قرار دیا گیا ہے۔ قاعدہ بنا دیا اور
کلیہ قرار دیدیا۔ درحقیقت یہ اسلام کی جامعیت ہے۔ اسلام کی ہمہ گیری

اور بقا کی دلیل ہے۔ اسلامی شریعت جامع اور تکمل ہے۔ اور کوئی جگہ اس سے مستثنیٰ نہین ہے۔ اسکے معنی یہ ہین۔ اور یہ خاص رمز ہے اسلام کے عموم وشمول کا باعتبار زمانہ ودوام وبقا کے۔

یقیناً اسلام کی شریعت اس مختصر مجموعہ قرآن کے اندر ہے جو ہماری نظرون مین ایک محدود کتاب ہے اور اُن احادیث مین ہے۔ جن کا اگر ذخیرہ جمع کیا جائے جو صحیح اور قابل اعتبار ہیں۔ تو وہ بھی کچھ زیادہ نہین ہوتا۔ ہمین دنیا کے تمام جزئیات یعنی خاص خاص مواقع کے احکام نام لیکر کہان مذکور ہین لیکن کلیات کے تحت مین دنیا کے ضروریات باعتبار موقع ومحل سب بتلا دئے ہین۔ خاص زمانہ کے اعتبار سے خاص اشخاص کے اعتبار سے شریعت اسلام مین خصوصیت کیساتھ اُن احکام کا اندراج نہین ہے لیکن اسلام کی شریعت مین کلیات وقواعد ایسے واضح موجود ہین کہ ایک سمجھنے والا انسان ہر موقع ومحل کی مناسبت سے اُن کلیات سے احکام نکال سکتا ہے۔ اور اس بنا پر وہ شریعتین جو اس سے قبل تھین وہ اسکی حقدار نہ تھین کہ ہمیشہ کے لئے رہنمائی کر سکین۔ اسلئے کہ اُن کے ضروریات محدود تھے اور اسلئے احکام بھی محدود۔ شریعت اسلام نے ایسے احکام وقوانین قرار دئے جو ہر موقع پر اور ہمیشہ رہنمائی کے لئے کافی ہوتے ہیں یقینی ہمکو کبھی شریعت مین تبدیلی کی ضرورت نہین ہوتی۔ ہمکو کبھی حکم

اسلام کے علاوہ ضرورت کے موقعہ پر کسی خاص حکم کے بنانے کی ضرورت
نہین ہوتی ۔ بلکہ ہر موقعہ کے لحاظ سے خود شریعت اسلام مین احکام
موجود ہین ۔ اسی لئے یہ ضروری ہے کہ ہر زمانہ مین جس واقفکار سے
احکام دریافت کئے جائین وہ وہی ہو کہ جو اُس زمانہ مین موجود ہو اور
نتیجہ نکالنے کی قابلیت رکھتا ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اجتہاد کا دروازہ
کھلا رکھا ہے ۔ تاکہ اسلامی شریعت کا جوہر خاص کہ وہ ہمیشہ رہنمائی
کر سکے ۔ باقی رہے ۔ اسلام کے احکام ہرگز دشواری اور سختی پر مبنی نہین
ہین ۔ مگر یاد رکھئے کہ ایک دشواری وہ ہوا کرتی ہے جو پابندی کا لازمی نتیجہ
ہوتی ہے ۔ ہر آسان سے آسان چیز جب پابندی عائد ہو جائے تو طبیعت
پر گراں گذرتی ہے ۔ یہ پابندی وہ ہے جو حکم کا لازمی نتیجہ ہے ۔ یہ دشواری
وہ ہے جو حکم سے جدا نہین ہوتی اسی وجہ سے حکم کا نام تکلیف رکھا گیا ہے
کہ وہ انسان کی طبیعت پر ایک بار ضرور ہو گا صرف پابندی کی بنا پر ۔ اس
قسم کی سختی جو اصل پابندی کا نتیجہ ہو وہ اسلام کی طرف سے برطرف نہین ہے
اسلئے اصل احکام شریعت کے مقابلہ مین دنیا اگر عسر و حرج کے نفی والی آیتون کو
پیش کرے تو وہ استدلالی غلطی ہے ۔ اگر ہم حدیث سے پردے کو ثابت کرین؟
کہیے ۔ خدا تو کہتا ہے مایرید بکم العسر پھر یہ سختی کیسی ۔ جناب والا سختی
جو کسی حکم کا لازمی نتیجہ ہو وہ برطرف نہین ہے ۔ بلکہ کسی حکم شرعی کی پابندی

مین غیر معمولی صورتون کے لحاظ سے اور اتفاقی مواقع کی حیثیت سے غیر معمولی
سختی پیدا ہو تو وہ برطرف ہے۔

اگر ما یرید اللہ بکم العسر اور ما جعل علیکم فی الدین
من حرج اسکا مفہوم اتنا ہی عام ہوتا تو پوری شریعت ہی جاتی رہتی
اسلام نے ہر حیثیت اسے ہمارے لئے آسانیان قرار دین۔ شریعت نے
یقیناً ہمارے بقائے انفرادی کا احترام کیا۔ مگر اجتماعی زندگی کے مقابلہ
مین وہ انفرادی زندگی کو کوئی چیز نہین سمجھتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس وقت
مرکز اجتماعی پر مصیبت آ رہی ہو جس وقت کہ ہئیت اجتماعی پر کوئی بلا آ رہی
ہو۔ تو اُس مفاد اجتماعی کے بقا کے لئے اس انفرادی زندگی کو فنا کرنے کیلیے
تیار ہونا چاہیئے۔ یہ جہاد کا حکم کیا ہے؟ وہ انسان کی انفرادی زندگی جسکی
حفاظت کے لئے احکام مین تبدیلیان ہو رہی تھین۔ آج وہ موت کے
منھ مین بھیج دیجاتی ہے۔ آج وہ سلاح جنگ کے مقابلہ مین بھیجدی جاتی
ہے۔ فنا ہونے کیلئے۔ اس کے معنی یہی ہین کہ مفاد اجتماعی کے مقابلہ
مین مفاد انفرادی کوئی چیز نہین ہے۔

اسلام نے بے شک انسان کے لئے مال و دولت کو جائز قرار دیا
ہے۔ مگر اسوقت تک کہ انفرادی ترقی اجتماعی ترقی کے خلاف نہ ہو جائے
اسلام کا نقطہ نظر انسان کی زندگی کے متعلق یہ ہے کہ ہر شخص ترقی کرے

ایک فرد رہتے ہوئے اُس نوع کی جسکی وہ ایک ہستی ہے۔ ہر فرد ترقی کرے مگر فرد قوم ہونے کی حیثیت سے۔ درحقیقت قوم تو افراد کا مجموعہ ہی ہوتی ہے اسلئے افراد کی ترقی قوم کی ترقی ہوئی۔ مگر یاد رکھیے کہ افراد کی ترقی قوم کی ترقی اُسی وقت ہوگی جب احساس قومیت کے ساتھ ہو۔ اور اگر احساس قومیت کے ساتھ نہ ہوئی تو افراد کتنی بھی ترقی کر جائیں مگر قوم پھر بھی پستی کی حالت میں ہوگی۔ کیونکہ قوم تو نام ہے رشتۂ اجتماعی کا۔ جو مختلف افراد میں اتصال رکھتا ہے۔ ورنہ جسم کا اجتماع۔ باہمی نشست کی حیثیت سے اجتماع۔ مکان کی قربت کی حیثیت سے اجتماع ایک قوم کے افراد نہیں بنا دیتا۔ بہرحال ایک قوم کی تشکیل جو ہوتی ہے وہ اُس رابطہ کی وجہ سے ہوتی ہے جو ان افراد قومی میں بحیثیت شیرازۂ قومی کے قائم ہو جبتک یہ رابطۂ باہمی قائم ہے قوم ہے۔ اگر یہ فنا ہوا تو قوم جاتی رہی چاہے اُسکے افراد جتنے بھی کیوں نہ ہوں۔

درحقیقت اسلام تو ایسے ہی انفرادی زندگی کو چاہتا ہے جو احساس قومیت کے ساتھ ہو۔ اگر آپنے مال و دولت انفرادی حیثیت سے خزانوں میں بھر کر رکھ لیا۔ جس سے نہ آپ کو فائدہ پہونچتا ہے۔ نہ دوسروں کو۔ تو یہ مال و دولت آپکے لئے سبب ترقی نے لیکن بحیثیت قوم آپ کے لئے کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتا۔ میں تیورس سال یہ

بیان کر چکا کہ درحقیقت یہ سرمایہ زندگی جو ہے اُسکی مثال خون کی طرح ہے
جسم انسان میں۔ جس طرح یہ جب تک جسم انسان میں گردش کرتا ہے تمام
شریان و عروق میں چلتا پھرتا ہے اُس وقت تک اُس جسم کی زندگی
ہے اور اگر یہ خون کسی جگہ اُس جسم میں منجمد ہوکر رہ جائے۔ اور دوسرے
اعضاء جوارح اس سے محروم رہجائیں تو یہ اُس جسم کا مرض ہوگا۔ اور
اُسکی فنا کا پیش خیمہ قرار پائے گا۔ اسی طرح اگر یہ خون کسی منفذ کو پاکر
باہر بہنے لگے تو پھر انسان کا جسم فنا ہو جائے گا۔ ان میں سے ہر ایک
مرض ہے انسانی زندگی کو فنا کرنے کا۔ یہ تمام امراض ہیں مستقل۔
ایک یہ کہ خون منجمد ہوکر ایک جگہ رہ گیا۔ انسان مفلوج ہوگیا۔ کچھ اعضاء
بیکار ہو جائینگے۔ نتیجہ میں وہ اعضا بھی جو اس وقت خون رکھتے ہیں
فنا ہو جائینگے۔ ایک یہ ہے کہ کوئی ایسی رگ قطع ہو گئی کہ خون بہنے لگا
پھر بھی انسانی زندگی فنا ہو جائے گی۔ ان میں سے ہر ایک وہ ہے
جو انسانی زندگی کو فنا کرنیکا باعث ہے۔ وائے بر حال قوم اجب اتنے
امراض پیدا ہو جائیں تو کبھی اُن افراد کو اپنی زندگی پر ناز نہ کرنا چاہیئے
ایک طرف یہ مرض کہ بعض لوگ صاحب دولت بن بیٹھے اُنھوں نے
مال و دولت خزانوں میں محفوظ کر لیا۔ دوسرے فاقے کرتے ہیں تو اُنکی
بلا سے، اُن کو یہ گھمنڈ نہ کرنا چاہیئے کہ ہمارے پاس مال و دولت ہے

قوم اگر فنا ہو گئی تو کوئی فرد چھوٹے گی نہیں۔ یہ تمام بحیثیت افراد قوم فنا ہو جائینگے۔ اور اسکے باعث وہ خود ہوں گے۔

دوسری طرف درآمد و برآمد کا عدم توازن ہماری آمدنی کم اور مصارف زیادہ۔ ہمارا سرمایہ زندگی دوسروں کے پاس چلا جا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک وقت میں ہمارا جتنا سرمایہ ہے۔ وہ سب چلا جائیگا۔ جائدادیں چلی گئیں، مکانات چلے گئے، زمینیں چلی گئیں، سود در سود کے ذریعہ سے ہمارا جتنا سرمایہ تھا وہ سب دوسروں کے پاس چلا گیا۔ تجارت چھوڑ دی۔ اُسے عار و ننگ سمجھ لیا۔ اسی طرح جتنے ذرائع آمدنی کے تھے ترک کر دئیے۔ مگر ضروریات قائم، سرمایہ ختم ہو چکا۔ پرونوٹ پر روپیہ لیا۔ سود در سود مقرر کیا۔ اسلام کی تعلیم پر ہم نے عمل نہیں کیا۔ اسلام نے ہمارے لئے سود دینا اور لینا حرام قرار دیا تھا۔ ہم نے اسلام کی اس تعلیم سے غلط فائدہ اُٹھایا کہ غیر مسلم سے معاملت جائز ہے۔ اسکے معنی یہ ہم نے سمجھے کہ سود دینا جائز ہے حالانکہ ہرگز ایسا نہیں غیر مسلم کو سود دینا تو دو حیثیتوں سے حرام ہے ایک طرف سود ہونے کی وجہ سے حرام ہے دوسری طرف اعانت کفار ہونے سے حرام ہے۔ ایک طرف گناہ کیا دوسری طرف اعانت کفار کے باعث ہوئے۔

اس طرح ہم اپنے ہاتھوں سے فنا کی منزل پر پہونچے۔ ہم نے

ایک "ضرورت" کا لفظ سن لیا۔ کہ ضرورت کے وقت سود جائز ہوجاتا ہے لیکن ضرورت کے معنی ہم نے یہ قرار دے لئے کہ بچہ کا ختنہ ہے۔ ضرورت ہے ہمیں قرض لینے کی، صاحبزادے کی شادی ہے ہمیں ضرورت ہے قرض لینے کی "منت" مانی ہے۔ منت پوری ہوگئی۔ ضرورت ہے۔

اگر ضرورت کے یہ معنی ہیں تو بغیر ضرورت کے کوئی قرض ہی کاہے کو لینے لگا؟ اسکے معنی یہ ہوئے کہ سود ناجائز ہی نہیں۔ "ضرورت" وہ ہے جس کے موقع پر کہا جاتا ہے کہ "مردار کھانا جائز ہے" جسوقت کہ آپ مردار کھا سکتے ہیں اُسوقت سودی روپیہ لینا بھی جائز ہے۔ بغیر اسکے کسی وقت بھی جائز نہیں۔ اگر ہم اسلام کے قوانین پر عمل پیرا ہوجائیں تو آج ہمارے لئے دور زندگی پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر جب ہمیں خبر ہی نہیں تو نتیجہ فنا ہے اور کچھ نہیں۔

دین و دُنیا

دین و دنیا کے معاملہ میں یہ افتراق کہ کچھ لوگوں نے صرف آخرت پر نظر کی۔ دنیا کو نظر انداز کر دیا۔ کچھ لوگوں نے موجودہ حیات دنیا پر نظر ڈالی۔ اسلام نے اس معاملہ میں ایک معتدل حکیمانہ طرز عمل پیش کیا کہ تم اس دنیا ہی کے ضروریات کو پورا کرو تم اس دُنیا کی زندگی کے تمام

اُن لوازم کے ساتھ جو اس دنیا کے لئے ضروری ہیں زندگی بسر کرو مگر اسکے ساتھ ساتھ آخرت کے خیال کو بھی نہ بھلاؤ۔ تمام وہ تعلقات جو انسان کو دنیاوی زندگی کے ساتھ حاصل ہیں۔ تمام وہ ضروریات زندگی جو قدرتی قویٰ کے لحاظ سے انسان کے لئے لازم ہیں۔ اُنکے دروازے بند نہیں کر دیئے گئے۔ قدرت نے اگر قوت ذائقہ عطا کی تھی تو غذا سے منع نہیں کیا۔ قوت سامعہ عطا کی تھی تو آوازوں کے سُننے سے روکا نہیں۔ ہر طاقت جو عطا کی تھی اُس سے فائدہ اُٹھانے کا انسان کو حق دیا۔ احل لکم الطیبات تمھارے لئے پاک و پاکیزہ دنیا کی جتنی چیزیں ہیں وہ حلال ہیں۔

قل من حرم زینة اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق

اُن سے کہو کون ہے جس نے حرام کر دیا ہے۔ خدا کی پیدا کی ہوئی زینتوں کو اور پاک و پاکیزہ رزق کو جو خدا نے عطا کیا ہے اُس نے بہتر سے بہتر غذا کھانے کا حق دیا۔ بہتر سے بہتر لباس پہننے کا حق دیا۔

لیکن ہر چیز میں اپنی طرف سے ایک پابندی قرار دیدی تاکہ ہر چیز سے لذت اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ فرض شناسی کا بھی احساس رہے آپ کو بہتر سے بہتر غذائیں کھانے کا حق دیا مگر احل لکم الطیبات وحرم علیکم الخبائث کی تفریق قرار دے کر انھیں ہر موقع پر اپنی یاد بھی دلا دی۔

اگر آپ جائزہ لیجئے تو وہ چیزیں جو ماکول اللحم میں داخل ہیں اپنے مزے کے اعتبار سے کوئی نسبت درجہ نہیں رکھتیں۔ ان میں بہت لذیذ چیزیں ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ جو مزے کی چیزیں تھیں اُن کو قدرت نے روک دیا بلکہ اُن میں بہت سی چیزیں قدرت نے ہمارے لئے حلال قرار دیں یہ اور بات ہے کہ کسی کو شئے ممنوع ہی میں لذت محسوس ہو۔ الانسان حریص علی ما منع وہ لذت اعتباری لذت ہوتی ہے جو شئے ممنوع سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو اُن چیزوں میں جن کو قدرت نے جائز قرار دیا ہے۔ لذت مفقود نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی روک دیا۔ اُن چیزوں سے جو اُسکی نظر میں حکیمانہ حیثیت سے انسانی زندگی کے لئے مضر تھیں اُنکو روکنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ انسان بہتر سے بہتر غذا ڈھونڈ کر یہ احساس رکھے کہ کلوا واشربوا ولا تسرفوا اس طرح سے انسان نے لذت بھی حاصل کی اور فرض شناسی کے ساتھ خدا سے لو بھی لگائے رہا۔ اُسے بہتر سے بہتر لباس پہننے کی اجازت دی مگر پابند کر دیا کہ ریشم نہ پہنو۔ اُسکے بعد آپ بیش قیمت سے بیش قیمت لباس پہنئے کوئی اعتراض نہیں۔ انسان ڈھونڈے عالم کی بازاروں میں بہتر سے بہتر لباس اپنے لئے اختیار کرے جو انتہا سے زیادہ اُس کی توجہ کو مبذول کرتا ہو۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر اُسکے ساتھ ساتھ اسکا خیال لگا رہے کہ حریر محض نہو۔ اجزائے غیر

ماکول اللحم سے نہو اس طرح انسان نے لذت دنیا کو بھی حاصل کیا مگر خدا کو بھی نہیں بھولا۔ اسکے بعد انسان کے لئے قدرت نے نظام بشری کی اصلاح کے لئے ایسے ضروریات مہیا کئے کہ جن کی وجہ سے نسل انسانی کے جو دو طبقے قرار دئے ہیں صنف ذکور و اناث انکا ربط پیدا ہو سکے۔ انجیل کی تعلیم اپنے مقام پر کہ وہ ملکوت آسمان میں نہیں داخل ہوگا جو شادی کر لے اسکے معنی یہ ہیں کہ جو تفرقہ قدرت نے قرار دیا تھا وہ عبث ہے خدا کا ایک طرز عمل بیکار قرار پاتا ہے۔

اسکا نتیجہ یہ ہے کہ نسل انسانی فنا کی منزل کے قریب آجائے مگر پیغمبر اسلام کا یہ ارشاد النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ ہماری جماعت سے وہ شخص خارج ہے جو انکار رکھتا ہو شادی کرنے سے۔ اس طرح سے نسل انسانی کے باقی رکھنے کی فکر کی گئی۔ اسکے بعد انسان کو اختیار دیا کہ وہ فائدہ اٹھائے خدا کے احکام سے اور خدا کے احکام پر عمل کرے۔

لیکن ایسی پابندیاں عائد کر دیں جو نظام بشری سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً شوہر دار عورت سے عدم جواز کا حکم۔ غیر شوہر دار سے عقد کرنا جائز لیکن اسمیں بھی خاص الفاظ اور صیغے مقرر کر کے یہ چاہا ہے کہ اگر انسانی خواہشیں پوری ہوں بھی تو فرض شناسی کے احساس کے ساتھ یعنی صیغہ

خاص کا حکم اسلئے تھا کہ انسان کی وہ خواہشیں جن کی حیثیت یہ ہے کہ خدا کی یاد کو بھلادیں۔ اسمیں بھی ایسی صورتیں اختیار کرلی جائیں کہ انسان ان موقعوں پر بھی خدا کی یاد کو نہ بھولے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ جو چیزیں کہ خالی مادی صورت رکھتی ہیں اُن میں بھی اسلام نے اپنے حکیمانہ طرز عمل سے روحانیت کی روح پھونک دی ہے۔ اس سے بڑھکر کیا فرض شناسی کی تعلیم ہوگی۔ ایک وہ محل و موقع ہے۔ ایک وہ جگہ ہے جہاں پر تمام موانع مرتفع ہیں۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ مگر انسان کو اُسوقت بھی یاد آجاتا ہے کہ ہمارے خدا کا حکم ہے کہ کچھ الفاظ زبان پر جاری کرلئے جائیں۔ اسوقت تک ہمارے لئے اقدام کرنا مستحسن نہیں ہے۔ درحقیقت اسلام نے دنیا کو سمونا چاہا ہے آخرت میں۔ اور یہ چاہا ہے کہ تم اپنی ذاتی خواہشوں کو پورا کرو مگر احساس فرض کو بھی نہ چھوڑو خدا کی یاد دل سے نہ نکلنے پائے اُس نے یقیناً ایسی چیزوں سے روکا جو خدا کو بھلا دیتی ہیں۔ لھو و لعب سے اسلئے منع کیا کہ وہ خدا کی یاد کو بھلا دیتے ہیں۔ "لھو" کا کوئی معیار ہی مقرر نہیں لھو کو لھو اس لئے کہتے ہیں کہ یلھی عن ذکر اللہ وہ خدا کی یاد سے غافل بنا دیتا ہے" ایسی چیزوں کو جو خالص مادیت کا لباس پہنکر روحانیت سے الگ ہوجائیں اُن سے منع کردیا لیکن ذرایع صحت جسمانی کو جائز رکھا۔ میں نے کل عرض کیا کہ احکام تک برطرف کردئے

جانتے ہیں انسان کی صحت جسمانی کے لحاظ سے۔ اُس نے ذرا ذرا سی صورتوں میں انسانی ضروریات کا لحاظ رکھا جسمانی ہوں عملی ہوں۔ روحانی ہوں۔ ہر قسم کے ضروریات۔ نماز! اس سے بڑھکر کوئی عمل نہیں ہے ان قبلت قبل ما سواھا وان ردت رد ما سواھا۔ اگر یہ عمل قبول ہو جائے تو دوسرے عمل میں بھی صلاحیت قبولیت پیدا ہو جاتی ہے اور اگر یہ عمل رد ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ کسی عمل میں صلاحیت ہی نہیں لیکن اتنا بڑا عمل۔ نماز۔ اُن مواقع پر توڑ دینا جائز قرار دیدیا جہاں آپ کا کوئی نقصان ہو رہا ہو یعنی آپکے کپڑے روپیہ پیسہ کوئی اور چیز رکھی ہوئی ہے تھوڑی دور پر۔ آپ کی نماز سے فائدہ اُٹھاکر چور آتا ہے چاہتا ہے کہ اُسے اٹھالیجائے لیکن اسلام اس نقصان مالی کو گوارا نہیں کرتا کہ آپ چور کو کپڑے لے جانے دیجیے۔ آپ نماز توڑ دیجیے۔ آپکا کسی پر قرضہ ہے مجبوری نہیں بلکہ بہ شرارت وہ آپ کا قرضہ نہیں دیتا۔ آپ نماز میں مشغول ہیں اتفاق سے وہ اُسوقت آجاتا ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اگر اسوقت آپنے جانے دیا تو پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ آپ نماز توڑ دیجیے اور اپنا قرضہ وصول کر لیجیے۔ اسکے بعد پھر نماز پڑھ لیجیے۔ اسلام نے اتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں انسانی ضرورت کا لحاظ رکھا۔ بیشک جب موقعہ ہو تقابل کا دین و دنیا میں تو دین کو مقدم قرار دیجیے یعنی

ایسے موقع پر کہ آب وضو بلاقیمت نہیں ملتا ہے۔ اور ایک شخص کے پاس ہے۔ مگر وہ بیش قرار قیمت کہتا ہے۔ وہ تین چلّو پانی کی قیمت پچاس روپیہ مانگتا ہے۔ اب ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ کے پاس پچاس روپیہ ہیں مگر۔ آپ دیدیں تو آپ کے ضروریات زندگی پوری نہ ہو سکیں گے۔ یہاں تو بے شک حکم نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ اتنے صاحب حیثیت ہیں کہ پچاس روپیہ دیدیں تو آپکے نظام زندگی میں خلل نہ پڑے گا۔ مگر اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپنے خواہ مخواہ ایک پروگرام قرار دے لیا ہے کہ اسمیں تبدل واقع ہو جائے گا۔ یہ معنی نہیں ہیں۔ اس مقام پر بے شک آپ پر واجب ہے، کہ اگر کوئی دس ہزار روپیہ پر تین چلو پانی دینے پر تیار ہے تو آپ کو دس ہزار روپیہ دینا چاہیئے۔ اس مقام پر فرض کی اہمیت بتائی گئی ہے یہاں ہماری نظر ظاہری کو اضطراب ہوتا ہے کہ یہ شخص جس کو دس ہزار روپیہ دیدینے کا حکم ہوتا ہے صرف تین چلو پانی کے عوض میں اس سے آب وضو کی قیمت میں دس ہزار روپیہ دلا دئے جاتے ہیں۔ اور حفاظت کے موقعہ پر دس روپیہ کی گھڑی کی مثلاً حفاظت جائز قرار دی جاتی ہے کہ نماز توڑ کر دس روپیہ کی گھڑی کی حفاظت کر لو۔ مگر یہاں ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے دو چیزوں کو جمع کر کے دکھایا ہے۔

اول تو فرض کی اہمیت کا اندازہ کرنا تھا کہ۔ دیکھو! یہ عمل اتنا

اہم ہے کہ دس ہزار روپیہ بھی اسکے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ لہٰذا اگر دس ہزار روپیہ کو آب وضو ملے تو خرید کرو۔ یہ امتحان ہے حکم خدا کے مقابلہ میں ضروریات زندگی کو مقدم نہ سمجھنے کا یعنی مال و دولت ایک طرف اور خدائی احکام ایک طرف۔ دونوں میں تصادم۔ تو وہاں انسانی اختیار کے آزمانے کا موقع تھا۔ نماز شروع ہونے کے بعد اب منزل ہے اسکے دکھلانے کی کہ انسانی ضرورت کا اُسکو کہاں تک خیال ہے اُسوقت تک آپ آزاد تھے۔ تو اُسکی طرف سے آپکا امتحان تھا کہ "دیکھیں تم ہمارے فرائض کے مقابلہ میں کہاں تک ایثار کیلئے تیار ہو"۔ اب انسان اُسکے شکنجۂ حکم میں مقید ہو گیا۔ اب وہ اپنی مراعات دکھلاتا ہے کہ دیکھو "مجھے تمہارا اتنا خیال ہے" "کہ میں خواہ مخواہ تمہارا اتنا بھی نقصان گوارہ نہیں کرتا"! اسکے علاوہ جب دس ہزار روپیہ قیمت میں آب وضو کے لا دئے! وہ اور بات تھی۔ اسلئے کہ انسان وہی ہے جسے ذوق طاعت ہو۔ اُسکو اسی میں مسرت حاصل ہو گی۔ یاد رکھئے کہ اُسے دس ہزار دے کر بھی خوشی ہو گی کہ میں نے وضو کر کے نماز پڑھ لی۔ اور دس ہزار روپیہ کے عوض میں انسان نے عبادت ایسی لذیذ شے حاصل کی۔ وہاں چور اور ڈاکو آجاتا ہے دس روپیہ سہی مگر بظلم و تعدی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اب یہ گناہگار کی ہمت افزائی تھی کہ یہاں لیجانے دیا جائے وہ چند روپیہ سہی قدرت کیوں

گوارا کرے۔ اگر یہ دروازہ کھول دیا جاتا۔ تو مجرموں کے لئے راستہ صاف ہو جاتا۔ قدرت نے یہ حکم دے کر ہمارے سامنے دونوں پہلوؤں کو پیش کیا کہ یہ نہ سمجھنا عبادت مال دنیا کے مقابلہ میں سبک ہے۔ یہ با حقیقت چیز ہے۔ درحقیقت روح حیات ہے عبادت مال کے مقابلہ میں سبک نہیں ہے

پھر اپنی مصلحت پروری اور انسانیت نوازی کا ثبوت یہ دیا جو بیان کیا گیا۔ غرض اسلام نے انسانی زندگی کے لیے جو لائحہ عمل تجویز کیا۔ وہ یہ کہ ضروریات زندگی کو پورا کرتے ہوئے۔ روحانیت کا بھی جوہر محفوظ رکھا۔ وہ کسی طرح سے اس چیز میں اپنی خوشنودی و رضامندی نہیں سمجھتا کہ خواہ مخواہ کو آپ اپنے نفس کو تکلیف دیجئے۔ آپ دو گھنٹہ دھوپ میں کھڑے ہو جئیے۔ اسلئے کہ خدا رضی ہو۔ خدا اس سے رضی نہیں ہوگا بے شک اُن فرائض کے سلسلہ میں جو اُسنے عائد کئے ہیں اگر تکلیف ہو تو جتنی تکلیف ہوگی اُتنا ہی اجر بھی بڑھائے گا مستقل طور سے صرف تکلیف ہی حاصل کرنا اپنے مدنظر نہ رکھئے اپنے مدنظر فرائض کا ادا کرنا ہی رکھئے افضل الاعمال احمزھا سخت ترین عمل وہ ہے جو زیادہ تلخ ہو اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ کے لئے زیادہ تکلیف اختیار کیجئے۔ نہیں بلکہ ادائے فرض کے سلسلہ میں تکلیف اُٹھانا پڑے تو فرض کو نہ چھوڑیئے اُسوقت معلوم ہوگا کہ آپ کی نظر میں فرض کہاں تک اہم ہے

اس طرح نہ انسانی ضروریات زندگی کو نظر انداز کیا گیا۔ نہ آخرت کا خیال نظر انداز کیا گیا۔ فراہمی موال بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام مال و دولت جمع کرنے کے منافی ہے یعنی مال و دولت کی طرف توجہ ہی کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے بے شک یہاں پر نقطۂ خیال مختلف ہوگیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے دنیا میں ایسی سرمایہ داری کو اختیار کرلیا ہے جو اسوقت زیادہ تر طاقتور سلطنتوں میں پائی جاتی ہے کچھ لوگوں نے اسکے خلاف وہ مسلک اختیار کرلیا ہے جو اسوقت روس کی اشتراکیت میں ہے وہ کہتے ہیں مال و دولت کسی ایک کے پاس رہنا ہی نہیں چاہیئے۔ بلکہ مساوی حیثیت سے سب کے پاس ہونا چاہیئے۔ زمین سب کی ہے۔ کوئی چیز کسی سے مخصوص نہیں رہنا چاہیئے۔ بعض لوگ جنھوں نے اسلامی تعلیمات کا پورے طور سے مطالعہ نہیں کیا ہے۔ وہ روس کی اشتراکیت کو اسلام کے سر منڈھنا چاہتے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ روس کی اشتراکیت اسلام کا حکم ہے۔

اسکے خلاف بعض لوگ ایسے ہیں جو اسلام کو سرمایہ داری کا حامی بتلاتے ہیں۔ درحقیقت لوگوں نے اسلام کی تعلیمات کی صحیح روح کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اسلام جس طرح ہر چیز میں ایک نقطۂ اعتدال کو پیش کرتا ہے۔ اور اسی میں اسکی حقیقی کامیابی کی روح مضمر ہے۔ اسی طرح

اس اشتراکیت و سرمایہ داری ہیں وہ ایک نقطۂ اعتدال کا حامل ہے۔
میں کہتا ہوں کہ اسلام اشتراکیت کا حامی ضرور ہے لیکن خود
اختیارانہ اشتراکیت کا جبریہ اشتراکیت کا نہیں (ایک مختصر سا جملہ ہے
جس کی تشریح بہت طویل ہے۔ مگر مجھے اب وقت کم ہے) اسلام اشتراکیت
کا حامی ضرور ہے۔ اسکی توضیح مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ حضرت احدیت
نے دنیا کو عالم اسباب قرار دیا ہے اور اسباب کے اوپر نتائج کو مرتب قرار
دیا ہے۔ اسلام کی شریعت چونکہ قانون فطرت کی پابند ہے اس لئے
اس نے بھی ہر شے کے لئے کچھ اسباب مقرر کر دیے ہیں۔
اگر ایسے اسباب مجتمع ہو گئے تو شریعت اپنے قانون کے موافق اُن
نتائج کو مترتب کرے گی جو اُن اسباب سے تعلق رکھتے ہیں۔ شریعت نے
جس طرح ہر چیز کے لئے نتائج قرار دئے ہیں اسی طرح ملکیت کے لئے
بھی کچھ اسباب قرار دے ہیں۔
بے شک اس نے ہر شخص کو دعوت دی ہے کہ میدان عمل میں آکر
ایک دوسرے پر سبقت اختیار کرے۔ درحقیقت کامیابی کا جوہر مسابقت
میں ہے۔ زندگی کا مزا ایک دوسرے کے آگے بڑھنے میں ظاہر ہوتا ہے
اگر اس نے اپنی طرف سے چپہ چپہ برابر تقسیم کر دیا ہوتا۔ تو پھر عمل کا
میدان ہی کہاں رہتا۔ پھر سعی کی کوشش کے لئے وسعت ہی کہاں

باقی رہتی۔ اسلئے اُس نے مال و دولت کو تمام قیود سے آزاد۔ بغیر کسی مالک خاص کے اپنا قرار دیا۔ یعنی جتنی دنیا کی چیزیں ہیں وہ اُن تمام اسباب سے قطع نظر کر کے کس شخص کی ہیں؟ خدا کی' ان الارض للہ زمین خدا کی ہے دنیا میں جو کچھ مال ہے وہ سب خدا کا ہے۔ ہر چیز عالم کی صرف اُسکی ذات سے مخصوص ہے۔ دولت خزانہ جتنی چیزیں ہیں وہ سب اُسی کی ہیں۔

اسکے بعد اس نے موقعہ دیا اور اسباب قرار دئے کہ وہ چیزیں جو میری ہیں۔ دنیا کی وسعت جو مجھ سے مخصوص ہے اسمیں سب کا حق ہے اور کسی کا بھی نہیں ہے۔ اس طرح اُس نے دنیا کو موقع دیا آگے بڑھنے کا پھر اسباب مقرر کئے۔ جن کے ذریعہ سے کوئی شے کسی کی قرار پا سکتی ہے جو زمینیں ہیں وہ اِن ذرایع سے ملکیت قرار پا سکتی ہیں کسی شخص کی۔ خزانے ہیں وہ اس طرح سے۔ درخت ہیں وہ اس طرح سے۔ شروع میں تو کسی کا کچھ بھی نہیں تھا۔ اسکے بعد اسباب مقرر کئے گئے۔ اسباب میں کسی کا نام نہیں قرار دیا گیا کہ فلاں شخص کی یہ ملک ہوگی۔ بلکہ جو اپنے لئے زیادہ سے زیادہ مقدار میں اُن نتائج کو حاصل کر سکے جو قدرت نے اُن اسباب کیلئے مقرر کئے ہیں اس طرح میدان عمل میں مسابقت کی دعوت دی۔ کہ۔ آؤ! اس میدان عمل میں اُترو۔ اسباب موجود ہیں اسباب کے ذریعہ سے نتائج کو حاصل کرو۔

میں ابھی کہہ چکا کہ وہ ہر چیز میں فرض شناسی کا لباس پہنا کر روحانیت کا لباس ضرور پہنا دیتا ہے۔ یہاں پر بھی درحقیقت مادیت نے روحانیت کا لباس پہن لیا۔ یہاں سے خدا شناسی کا عنصر شریک ہو گیا اب اگر کسی شخص نے افراد انسانی میں سے اپنی قوت عمل کو بیکار رکھا معطل رکھا خدا کی دی ہوئی چیزوں سے فائدہ نہ اُٹھایا۔ اور دوسرے شخص نے عمل کیا۔ اُن اسباب سے بیش از بیش فائدہ اُٹھایا۔ ان ذرائع عمل کو اختیار کیا۔ جسکے ذریعے سے مال و دولت بیشتر حاصل ہوتی ہو۔ تو قدرت یہاں پر بے انصافی سمجھتی ہے کہ وہ برابر کر دے ان دونوں کو۔ اگر کسی شخص نے اس مال و دولت کو ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہے تو بیشک اس کی ہر ایک چیز اُس اصلی مالک کی ہے جس سے اُس نے ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہے لیکن اگر جائز ذریعہ سے کسی نے اپنے مال و دولت میں اضافہ کیا ہے۔ اور دوسرے شخص نے اُن ذرائع سے حاصل نہیں کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ قدرت گردن پکڑ کر اُن کو مجبور کرے کہ اُسکی تمام مال و دولت تقسیم ہو جائے دوسرے لوگوں میں جن کا اس عمل میں کوئی حصہ نہیں تھا لیکن۔ ہاں!۔ اُن لوگوں کو مخاطب کر کے جنھوں نے مال و دولت حاصل کیا ہو اُن کے اوپر ایسے احکام و فرائض عائد کر دے کہ وہ خود بارادہ و اختیار خود اپنی خوشی سے اُن لوگوں کی جو درحقیقت اپنی ذاتی کوتاہی سے

یا اسباب کی کمی سے یا حوادث اتفاقیہ سے اُس معیار بلندی پر نہیں آسکے اور فقر وفاقہ کی دشواریوں کو اُٹھا رہے ہیں اُن کی کفالت ہو سکے الاغنیاء امنائی والفقراء عیالی " مال و دولت رکھنے والے ہمارے امانتدار ہیں۔ اور فقیر ہمارے واجب النفقہ ہیں "

اس طرح اشارہ کیا کہ اگر کسی نے کسی فقیر کی خبر گیری کی تو گویا اُس نے ہمارے سوال کو پورا کیا۔ اسلئے کہ کسی کے واجب النفقہ کی آپ خبر گیری کر دیجئے تو گویا اُس کو دیدیا۔

یہ ارشاد کیا " اے موسیٰؑ! اگر میں تمھارے دروازہ پر آؤں تو کیا دوگے؟ موسیٰؑ کانپ گئے۔ جواب کیا دیں، ارشاد ہوا۔ اگر کوئی فقیر تمھارے دروازہ پر آئے تو سمجھو کہ میں آیا ہوں۔ اس طرح سے اغنیا کی اموال میں فقیروں کو شریک قرار دیا۔ لیکن یہ وہی شرکت خود اختیاری ہے۔ اس طرح اُس شخص کی محنت کا پھل بھی دیدیا۔ جس نے اپنی ذاتی محنت ومشقت سے روپیہ کمایا تھا۔ اور اُس فقیر کی ضرورت کو بھی پورا کر دیا۔ جو اس میدان عمل میں پیچھے رہ گیا تھا۔ اسکے بعد زکوٰۃ وخمس کے احکام جاری کئے۔ یہ احکام ایسے ہیں کہ اگر ان پر صحیح طریقہ سے عمل ہوتا رہے۔ تو مسلمانوں میں کوئی شخص بھیک مانگنے پر مجبور نہ ہو۔ لیکن اسکو کیا کیا جائے کہ اغنیا اپنے فرائض کا احساس نہ کریں۔ وہ خدا کی

دیئے ہوئے مال و دولت کو اس طرح سمجھیں کہ گویا وہ کسی دوسرے محسن کے دست نگر نہیں ہیں۔ وہ بیکار کے مصارف میں کتنا ہی صرف کردیں کتنا ہی زیادہ سے زیادہ مقدار میں دیدیں۔ بطور پیش کش کے بڑی بڑی ہستیوں کو کتنا ہی وہ اپنے خزانہ سے بھر دیں لیکن زکوۃ و خمس کے نام سے دینا نہیں نصیب ہوتا۔ وہ علم حساب حاصل کرتے ہیں مگر اپنی آمدنی اور صرف کیلئے نہیں۔ انھوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنی عمر بھر میں کتنا حاصل کیا۔ انھوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا تھا اسمیں خدا کی طرف سے ہمارے اوپر کیا عائد ہوا تھا۔ وہ سرکاری حکام کے ٹیکسوں کو خوب ادا کرتے ہیں۔ چاہے اسلئے کہ اسمیں قرقی اور وارنٹ کا خوف ہے۔ لیکن خدا کی طرف کا جو مطالبہ ہے۔ اسپر نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ ہم؟ ہماری زبانیں بھی خاموش یعنی وہ لوگ جو درحقیقت ان باتوں کی طرف متوجہ کرنے والے تھے۔ انکی زبانوں پر قفل لگ گئے اسلئے کہ لوگوں کو خیال ہوگا یہ اپنے لئے کہتے ہیں۔

میں آپ سے کہتا ہوں کہ یہ خیال غلط ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ زکوۃ و خمس کے روپیہ کو آپ کسی مجتہد کے سامنے پیش کریں۔ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ مجتہد مستحق کی شناخت میں آپ سے زیادہ ناواقف ہو۔ آپ کو ذاتی طور پر لوگوں سے ملنے جلنے کا زیادہ موقع ہے۔

آپ مستحق و غیر مستحق سے بہ نسبت اُس جماعت کے زیادہ واقف ہیں جو گوشہ گیر ہو۔ جو ظاہر پر عمل کرتی ہو۔ جسکے سامنے لوگ جاکر زیادہ پابندی مذہب کا اظہار کرتے ہوں۔ اسلئے کہ معلوم ہے کہ ملے گا تو یہیں سے ملے گا۔ بہت ممکن ہے کہ مستحق کی شناخت آپ کو زیادہ ہو۔ اسلئے آپ زکوٰۃ و خمس کے احکام کو کتابوں میں دیکھ لیجئے۔ یا کسی مجتہد سے پوچھ لیجئے لیکن اسکے آپ کبھی منتظر نہ رہیئے کہ ہم آنکے پاس بیش کریں۔ بلکہ آپ اگر اپنے اور خدا کے درمیان۔ اپنے ذاتی احساس ذمہ داری کے ساتھ اُس کو صحیح مستحقین تک پہونچا سکتے ہیں تو آپ اپنے ذمہ سے ادا ہو جائینگے۔ چاہے آپ کسی عالم دین کی صورت کبھی نہ دیکھیں مگر زکوٰۃ و خمس ادا کیجئے۔ آپ شہر میں نہ دیجئے۔ بیرون شہر میں دیجئے۔ اگرچہ شہر کا حق مقدم ہوتا ہے۔ لیکن بہر حال ادا تو کیجئے۔ ان ذمہ داریوں کا ہمارے سر عائد کیا جانا تو ہماری پریشانی کا سبب ہے۔

فطرہ کا روپیہ ہمارے پاس آتا ہے تو ہمارے لئے وبال جان ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو اپنی نگاہ پر اعتماد ہے تو آپ ہی دیجئے لیکن خدا کا حکم ادا کیجئے۔ خدا کے فرض سے غافل نہ ہو جیئے۔ اگر آج اسپر عمل ہوتا تو یہ حالت نہ ہوتی لیکن وہ اشخاص جنہوں نے گداگری کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے وہ لوگ نظر قدرت میں ایک سخت معصیت کے مرتکب

ہوتے ہیں جو قریب ہے کفر کے ساتھ۔ جو قریب بہ شرک ہے۔ اسلئے کہ یہ خدا کو چھوڑ کر دوسرے کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں اگر وہ نماز کے پابند ہیں تو کہتے ہونگے " ایاک نعبد وایاک نستعین " ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے امداد طلب کرتے ہیں لیکن گداگری سے ظاہر ہے کہ خدا پر بھروسا نہیں ہے۔ دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں۔ سوال کرنا اسلام میں وہ چیز ہے کہ جس وقت مردار حلال ہوتا ہے۔ اسوقت سوال کرنا جائز ہوسکتا ہے۔ ورنہ گداگری اسلام میں جائز نہیں ہے۔

لیکن پھر بھی کیا کہنا اسکے تفضل کا۔ ایک طرف تو گداگری کو اتنی بڑی معصیت قرار دیا۔ لیکن دوسری طرف اسکے لئے یہ حکم دیا کہ اب اگر اسنے اس معصیت کا ارتکاب کیا ہی ہے۔ اب اگر اس نے معیار انسانی کو پست کر ہی دیا ہے تو تم انسانیت کو بدنام نہ کرو تم رد سوال نہ کرو۔ ایک طرف اسکو روکتا ہے۔ خبردار! مانگنا نہیں! دوسری طرف آپکو حکم دیتا ہے کہ خبردار! سوال رد نہ کرنا! اما السائل فلا تنھر "سوال کرنے والے کو دور نہ کرو۔ اسکو جھڑکو نہیں "

اس طرح سے نظام زندگی کا معیار قرار دیا۔ اگر اسپر عمل ہو تو دنیا کہاں سے کہاں پہونچے۔ لیکن عمل نہیں ہوتا۔ بے شک یہ یاد رہے کہ اگر

کسی موقع پر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے نہ دینے سے اور سوال کو پورا نہ کرنے سے عادت گدائی کی چھوٹے گی تو اُسوقت آپ کو سوال کا رد کرنا مستحسن ہوگا۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو رد سوال نہ کیجئے۔

عبادت کا صحیح مفہوم

تجارت اور کسب معیشت کی اہمیت

اسلام نے انسان کو عبادت کا جو حکم دیا ہے اُسکے متعلق غلط فہمی ہے بعض اشخاص نے عبادت کی غرض غلط قرار دی۔ بعض لوگوں کو عبادت کے معنے سمجھنے میں یہ غلط فہمی ہوئی ہے۔ کہ عبادت صرف نماز و روزہ کا نام ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عبادت کا مفہوم یہ نہیں ہے عبادت کا مفہوم ہے فرائض کا ادا کرنا۔ عبادت کے معنی ہیں خدا کی رضامندی حاصل کرنا اپنے اعمال کے ذریعہ سے۔ اسمیں تمام وہ شعبے زندگی کے داخل ہیں جن پر تمام انسانوں کو عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

انفرادی افعال ہیں اجتماعی افعال ہیں۔ حق اللہ میں حق الناس ہیں۔ ہر چیز میں انسان کا جو فرض ہے اسکو ادا کرنا یہ عبادت میں داخل ہے وہ چیز کہ جس کو بالکل ہی عبادت سے الگ سمجھا جاتا ہے۔ یعنی

مال و دولت کا حاصل کرنا۔ وہ بھی عبادت کا ایک جُزء ہے حلال طریقہ سے مال و دولت کا حاصل کرنا ہرگز دین سے الگ نہیں ہے۔

"تجارت اور اسلام" کے سلسلہ میں بیان کر چکا ہوں کہ جناب رسالتمآبؐ مسجد میں تشریف رکھتے تھے کہ ایک خوش شکل و شمائل جوان اُدھر سے ہو کر گذرا اصحاب کرام نے یہ کہا: "افسوس اسکی جوانی پر۔ کاش یہ جوانی عبادت خدا میں صرف ہوتی۔

"جناب رسالتمآبؐ نے سنا تو فرمایا۔ "کیا کہا تم نے؟"

"اُنھوں نے کہا" کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ جوان اپنی جوانی کو گذار رہا ہے طلب دنیا میں۔ کاش احکام کے پورا کرنے اور عبادت میں گذارتا۔ آپنے فرمایا! "یہ تم نے کیونکر کہہ دیا کہ اسکی جوانی راہ خدا میں صرف نہیں ہو رہی ہے اگر اس کا مال دنیا طلب کرنا اسلئے ہے کہ اپنے اہل و عیال کے رزق کی کشائش کر سکے۔ اور اُنکے لئے سامان رحمت مہیا کرے۔ تو وہ خدا کی راہ میں ہے۔ عبادت میں مصروف ہے۔ اگر اسلئے مال و دولت حاصل کرتا ہے کہ اُسکے ذریعہ سے حج کرے صدقہ عطا کرے تب بھی وہ خدا کی راہ میں ہے۔

ہاں! بے شک! اگر مال و دولت کو صرف اسلئے حاصل کرتا ہے کہ اپنے ابنائے جنس میں تفوق حاصل کرے تب بے شک شیطان کے رستہ

میں ہے۔ تو انسان اگر مال و دولت کو حاصل کرنا چاہتا ہے اسلئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ امور خیر کا انصرام کر سکے تو کون کہتا ہے کہ وہ عبادت سے الگ ہے ؟

تجارت وہ چیز ہے جسے انبیاء و مرسلین نے کیا لیکن ہماری تو یہ حالت ہے کہ ہم نے تجارت کو اپنے لئے سبب توہین سمجھ لیا۔ ہم نے اپنے لئے سبب حقارت و ذلت سمجھ لیا ہے۔

ہماری یہ حالت ہو کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص کبھی تجارت کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ یہ اشتہار شائع کرتا ہے کہ گردش زمانہ سے اب شیعوں کی حالت پہونچی ہے کہ وہ تجارت کر رہے ہیں۔"

اسکے معنی یہ ہیں کہ تجارت عار و ننگ ہو۔ تجارت گداگری سے بھی بڑھکر ہے "گردش زمانہ سے اب حالت پہونچی ہے" یاد رکھیے کہ جس کام کو آپ ذلت سمجھکر اختیار کریں گے دنیا حق رکھتی ہے کہ اُسپر آپ کو حقارت کی نظر سے دیکھے۔ اگر گردش زمانہ سے یہ وقت آیا ہے تو اسکے یہ معنی ہیں کہ گردش زمانہ سے ہماری زندگی کا دور آیا ہے ہماری کامیابی کا سلسلہ شروع ہوا ہے لیکن کوئی کام اس طرح سے نہیں ہوتا جس طرح سے ہم کرتے ہیں۔ آپ نے تجارتیں کرنا شروع کیں تو اُس کو ایک غیر معمولی صورت سے شروع کیا علماء کو بلاکر دوکانوں کا افتتاح کرایا۔ اشتہار شائع کیا کہ شیعوں کو قومی حیثیت سے تجارت کی ضرورت ہو اسلئے ہم نے تجارت کا سلسلہ شروع کیا۔ فلاں شخص نے

اپنے مواعظ میں چونکہ تجارت پر ترغیب دلائی تھی اُسکے مواعظ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہم اس دوکان کا افتتاح کر رہے ہیں۔

بندہ پرور اس طرح سے تجارت نہیں ہوتی۔ آپ کیوں ڈرتے ہیں۔ آپ کوئی کام شروع کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے مواعظ سے مجبور ہو کر میں اسکو شروع کرتا ہوں۔ آپ کیوں یہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں کہ ہم ضروریات زندگی سے مجبور ہو کر تجارت کرتے ہیں۔ کیوں نہیں کہتے کہ " ہماری زندگی موقوف ہے تجارت پر اسلئے تجارت کرتے ہیں۔ آپ تاجر بننا چاہتے ہیں تو مصلح کی شکل کیوں اختیار کرتے ہیں۔ آپ تجارت کیجئے دوکانداروں کی شکل میں، اس کو کوئی دوسرا لباس نہ پہنائیے۔ پھر بھی اچھا ہے۔ یوں ہی رفتہ رفتہ افراد قوم کی ذہنیت میں تبدیلی ہوگی۔ اگرچہ آگے بڑھنے والے بہت آگے بڑھ گئے۔ لیکن ایک جگہ ٹھہرنے سے آگے بڑھنا پھر بھی بہتر ہے۔

اجتماعی زندگی کے مختلف پہلو

اسکے بعد اجتماعی زندگی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ایک گھر کے رہنے والوں کی زندگی۔ ایک شہر کے رہنے والوں کی۔ ایک ملک کے رہنے والونکی اسکے بعد تمام دنیا کے رہنے والوں کی زندگی۔ اسلام نے کسی جزو حیات کی تشنہ تعلیمات نہیں چھوڑا ہر شعبہ میں حیات کے اپنے علمی و عملی نقش قائم

کر دئے ہیں جس پر عمل کرنا صحیح طور پر کامیابی کا ذمہ دار ہے۔ تدبیر منزل سیاست مدن۔ کیا کہنا اسلامی قانون کی جامعیت کا! علمائے علم اخلاق کو اس باب میں کہنا پڑتا ہے کہ کیا کریں شریعت اسلام نے ضروریات کو پورا کر دیا۔ ایک کتاب فقہ کی جو احکام اسلام کی جامع ہے۔ وہی علم اخلاق کی جامع ہے جتنے دنیا کے شعبے ہیں سب شریعت اسلام کے اندر مکمل طور سے موجود ہیں۔ کس طرح سے اولاد کی تربیت کرنا چاہیئے۔

ارشاد ہوتا ہے جس طرح ایک بادشاہ اپنی رعایا سے نسبت رکھتا ہے ہر شخص کو اپنے گھر میں اپنی ذات میں وہی نسبت حاصل ہے۔ کوئی شخص اپنے تئیں ذمہ داری سے سبکدوش نہ سمجھے۔ کلکم راع وکلکم مسئول ہر شخص تم میں سے نگراں ہے اور ہر شخص تم میں سے جواب دہ ہے باپ کے مقابلہ میں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ باپ کو اولاد کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ زوجہ کو شوہر اور شوہر کو زوجہ کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے ان اسباب کو شریعت اسلام نے اس طرح سے پیش کیا کہ درحقیقت اس سے بہتر تعلیم دنیا میں ہو نہیں سکتی۔ تمام نظام عالم آپس کے سلسلہ احتیاج پر قائم ہے "یہ ایک مختصر سا جملہ ہے بے شک تمام نظام عالم سلسلہ احتیاج پر قائم ہے" لیکن اگر سلسلہ احتیاج یک طرفہ ہو تو نظام عالم معطل ہو جائے۔ قدرت نے نظام دنیا کو اس طرح سے قائم کیا ہے کہ ہر شخص محتاج ہے۔ اور ہر شخص محتاج الیہ

جب اس طرح سے تمام کڑیاں آپس میں جڑ بنگی۔ اُسوقت نظام عالم برقرار رہیگا اسلئے تقسیم عمل کا اصول نافذ کیا گیا کہ تقسیم عمل کے ذریعے سے ہر اشخص دوسرے کا محتاج البیہ بنجائے۔

تمام نظام عالم کی کڑیاں اس سے مضبوط ہوئی ہیں۔ اسی سے یہ کثرت وحدت کا لباس پہنتی ہے۔ کوئی مرکب اُسوقت تک عالم ترکیب میں رہ نہیں سکتا جبتک کہ اُسکے اجزا ایک دوسرے کی طرف احتیاج نہ رکھتے ہوں۔ دنیا کا انتظام ملک کا انتظام اسی طرح گھر کا انتظام اگر تمام عنصر جو گھر میں قدرت نے ودلیعت کئے ہیں یہ عناصر ایک دوسرے کی طرف محتاج نہ ہوں تو درحقیقت یہ نظام درست نہیں ہو سکتا۔ اسلئے قدرت نے اُنکے درمیان میں تقسیم عمل کیا چونکہ وہ شریعت بیکار ہے جو فطرت کے مطابق نہ ہو۔ اسلئے انسان کی فطرت کو دیکھا کہ باہر کے لئے کون مناسب ہو سکتا ہے اور اندر کے کون لائق تقسیم عمل کے اصول پر نظام قائم کیا۔ اور فرائض کو دو شعبوں میں تقسیم کیا۔ امور داخلی، اور امور خارجی، امور داخلی کا انتظام گھر کی ملکہ کے سپرد کیا۔ اور امور خارجی کا انصرام مرد کے حوالہ۔

کون کہتا ہے کہ اسلام نے عورت کا معیار پست مقرر کیا۔ کون کہتا ہے کہ اسلام نے عورت کو ذلت کی نظر سے دیکھا۔ اسلام نے مرد کو کارکن

قرار دیا۔ عورت کو ملکہ بنایا، مرد کو مزدور اور عورت کو سرمایہ دار قرار دیا۔ مرد کو حوادث دنیا کے تھپیڑوں میں ڈال دیا۔ مرد کے قوائے عمل کا اندازہ کیا اُس نے اُس کی بنیاد جسمانی کو پہلے سے اسکے مطابق قرار دیا تھا کہ دنیا کے بیرونی مشکلات کا مقابلہ کیے یہ سب کچھ مرد کیلئے چھوڑا۔ وہ باریک کام گھر کا۔ وہ جسمیں قوت شعور و خیال کی ضرورت ہے اُس کو عورت کے سپرد کیا۔ اور مرد کو باہر کے لئے قرار دیا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ عورت گھر میں بیٹھی ہوئی کام کرتی رہے۔ مرد باہر کام کرتا رہے۔ وہ جو کچھ حاصل کرے۔ لاکر اسکے پاس ڈالدے اُس مال و دولت کو یہ صرف کرے اور اس کا انتظام درست رکھے۔ اس طرح سے اُس نے انتظام قائم کیا گھر کا۔ اس طرح خانہ داری کے اصول کی تعلیم دی۔ آج آپ جائیے دنیائے متمدن میں دیکھئے۔ سب کچھ ہے کونسلوں میں عورتیں پہونچ گئی ہیں۔ اداروں میں اور دفتروں میں موجود ہیں۔ لیکن انتظام خانہ داری درست نہیں ہے؟

لوگوں نے گھر کو بگاڑ کر جنگل کو آباد کیا۔ خود برباد ہوئے۔ دوسروں کی خانہ آبادی کر دی۔ لیکن اسلام نے آپکے سامنے کیا قانون پیش کیا تھا اُدھر مرد کی فوقیت عورت پر ثابت کی۔ کہ اگر ہم نے اُسے کارکن قرار دیا ہے تو مزدور ہی نہ سمجھ لینا۔ الرجال قوامون علی النساء

"مرد صاحب اختیار قرار دیا گیا ہے عورت پر"
اس طرح اسکے معیار کو بلند کیا۔ عورت کے معیار کو لطف و رحمت
کے پہلو کو آگے بڑھا کر بلند کیا فرماتے ہیں۔
المرأۃ ریحانۃ عورت گلدستہ ہے۔ عورت گلاب کا پھول
ہے یعنی گلاب کے پھول کو جتنے ملائم ہاتھوں سے رکھ سکتے ہو۔ جتنا ملائم
سلوک تم کر سکتے ہو۔ اختیار کرو۔ اسکے بعد میں کہاں تک اس موضوع کو
بیان کر سکتا ہوں۔ اس لئے کہ بیان کی مسافت ختم ہو چکی ہے۔
گھر میں ماں اور بیٹا ہے۔ بیٹے کے لئے اُنکی اطاعت قرار دی
جس طرح باپ کی اطاعت قرار دی۔ یہ کہا کہ جنّت ماں کے پیروں کے
نیچے ہے۔ یہاں تک معیار بلند کیا کہ اگر کسی حکم الٰہی سے جو بحد وجوب ہو
تصادم ہو جائے والدین کے حکم کا تو وہ امر مستحب حرمت کا لباس پہن لیگا
یعنی بہتر سے بہتر عمل صالح۔ نوافل نماز۔ حج مستحب۔ زیارت۔ کو ماں نے
منع کر دیا۔ بس اب نا جائز ہے حرام ہے۔ وہاں تک کہ جہاں تک باپ کے سامنے
حکم ہے سرنگوں ہونے کا۔ ماں کے سامنے بھی حکم ہے لا تقل لھما اف ولا
تنھرھما۔ اس طرح دونوں کے معیار کو ایک رکھا گیا۔
بیشک جب خدا کے حکم کے مقابلہ میں والدین آئیں اسوقت کیلئے
ارشاد ہوا وان جاھداك لتشرك بی ما لیس لك به علم

خلاف قطعی اگر یہ لوگ تم سے اس بات کے طالب ہوں کہ تم خدا کے
ساتھ شرک کرو۔ تو پھر اُنکی اطاعت نہ کرنا۔

اولاد جبتک صغیر السن ہے اُسکے حقوق والدین پر قرار دیے گئے
لیکن جب بچہ سن تمیز کو پہونچ گیا اور بیٹا قابل اسکے ہوا کہ وہ کسب
معیشت کر سکے۔ اب باپ پر اُسکی ذمہ داری نہیں رہی۔ بیشک
باپ پر جو ذمہ داری تھی وہ تربیت کی تھی لیکن جب وہ تربیت کر چکا
تو اب بیٹے کا کوئی فرض باپ پر نہیں رہا۔ لڑکی بے شک جب تک
شادی نہ ہو اُسوقت تک اُس کا فرض باپ کے ذمہ ہے لیکن جب شادی
کر دی تو اب وہ دوسرے گھر کے انتظام سے متعلق ہوگئی اب اُس کا رابطہ
اُس پہلے گھر سے منقطع ہو گیا اب اس کے کچھ حقوق نہیں۔ ہاں باپ
کی میراث میں لڑکیوں کا بھی حصہ ہے لیکن افسوس کہ پنجاب وغیرہ میں
اور خود یہاں کے دیہاتوں میں مسلمانوں نے مثل ہندوؤں کے لڑکی
کا حصہ ہی میراث میں ختم کر دیا ہے۔ یہ بالکل شریعت اسلام کے خلاف ہے۔

نظامِ اجتماعی یعنی عام سیاست تمدنی

اسلام نے دنیا کے لئے یہ نظام قرار دیا کہ ہر شخص دوسرے کا احترام
کرے۔ درحقیقت آپس میں فسادات ہوتے ہیں اسوجہ سے کہ ایک

دوسرے کو اپنے سے کم سمجھتا ہے۔ اسلام کا یہ قانون ہے کہ کسی شخص کو حق نہیں ہے کہ اپنے کو دوسرے سے بہتر سمجھے۔ لا یسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونوا خیرا منھم ولا نساء من نساء عسیٰ ان یکن خیرا منھن۔ ہرگز ایک قوم دوسری قوم کا تمسخر نہ کرے۔ ممکن ہے کہ وہ تم سے اچھے ہوں"۔ اور نہ کوئی عورت دوسری عورت کا تمسخر کرے"۔ ممکن ہے کہ اُس کا مرتبہ بلند ہو۔

حدیث میں ارشاد کیا گیا دیکھو! بڑوں کو چاہیئے کہ چھوٹوں کی عزت کریں۔ کیوں؟ اسلئے کہ عمر اُن کی کم ہے۔ اُنھوں نے گناہ تم سے کم کئے ہوں گے۔ اور چھوٹوں کو چاہیئے کہ وہ بڑوں کی تعظیم کریں اسلئے کہ اُن کی عمر زیادہ ہے۔ اُنھوں نے طاعت تم سے زیادہ کی ہوگی۔ اور۔ دیکھو! برابر والوں کو چاہیئے کہ وہ برابر والوں کی عزت کریں۔ اسلئے کہ تمھارے گناہ تمھارے لئے یقینی ہیں لیکن دوسروں کے گناہ تمھارے لیے یقینی نہیں ہیں۔ کیا اس پر عمل ہو تو دنیا میں کوئی منافرت باقی رہ سکتی ہے؟

میں نے سابق میں عرض کیا ہے کہ اسلام نے اُن امتیازات کو مٹا کر جو عام افراد نے اپنے نظریوں کے مطابق دے لئے تھے۔ ایک دائرۂ مساوات قائم کیا۔ اسلام ہی وہ ایک واحد مذہب ہے جس میں شاہ و گدا مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ مذہبی حیثیت سے ایک بادشاہ کو اپنے ایک معمولی سپاہی پر کوئی تفوق حاصل نہیں ہے۔ اُس میں اگر تفوق

بھی قرار دیا گیا ہے تو روحانی اعتبار سے قرار دیا گیا ہے۔

نماز جماعت میں یہ حکم ضرور قرار دیا گیا ہے کہ امام کے بعد پہلی صف میں صاحبان تقویٰ۔ وہ نیک اعمال والے لوگ ہوں۔ جن میں ہر ایک حق رکھتا ہو امام جماعت ہونیکا۔ ہمارے یہاں تنظیم نہیں ہے اسلئے نماز جماعت کی ترتیب بھی درست نہیں ہے۔ امام کے بعد پہلی صف میں اُس سے متصل ایسے افراد ہونا چاہئیں جن میں سے ہر ایک نماز جماعت پڑھانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ تاکہ اگر امام کسی وجہ سے قاصر ہو جائے نماز کے ادا کرنے میں۔ تو اُن میں سے ایک شخص آگے بڑھکر مصلّے پہ پہونچکر نماز کو تمام کرے۔ لیکن اسکے علاوہ اور کوئی تفوق قرار نہیں دیا گیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ مالدار پہلی صف میں ہوں۔ فقیر دوسری صف میں یا معززین آگے ہیں گمنام افراد پیچھے۔

ایسا کوئی تفوق نہیں ہے۔ سب مساوی ہیں۔ ایک فقیر پہلی صف میں ہو۔ اور ایک امیر دوسری صف میں ہو۔ تو اُس امیر کا سر اس فقیر کے پیروں کے پاس ہوگا۔ یہ خصوصیت بھی اسلام سے مخصوص ہے۔ وہ جنھوں نے دائرۂ اسلام میں قدم رکھا۔ خواہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں۔ جب دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ تو اُنکے حقوق مساوی ہو گئے اُن تمام افراد کے ساتھ جو پہلے سے اسلام میں تھے

کوئی تفریق نہیں ہے۔ پست سے پست افراد جن کو لوگ حقارت کی نظر
سے دیکھتے ہیں اگر مسلمان ہو جائیں تو اُنکے حقوق مساوی ہیں۔ یہ بھی
دوسروں کو دیکھکر ہم نے تقلید کی ہے ہم نے سنا ہے کہ بہت سے وہ
(ہمارے محاورہ میں پست اور نیچ ذات کے) لوگ (نیچ ذات تو ہم نے
بنا دیا) نیچ ذات جنھیں مہتر کہتے ہیں۔ وہ اگر مسلمان ہو جاتے ہیں تو
بہت سے افراد اہل اسلام اُن کے پاس بیٹھنے سے پرہیز کرتے ہیں۔
یہ اسلام کی تعلیم کے بالکل مخالف ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو ہم نے
دوسروں کو دیکھکر اختیار کر لیا ہے۔ اگر آپ دول اسلامیہ میں جہاں
خو بو اصل اسلام کی باقی ہے جہاں دوسروں کی ہمسایگی نے ہمارے
اخلاق کو تبدیل نہیں کیا ہے جاکر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ وہاں بالوعہ
صاف کرنے والے لوگ۔ دن میں بالوعہ صاف کرتے ہیں اور سر سے پاؤں تک
نجاستوں میں لت پت ہوتے ہیں لیکن ادھر غسل کیا صاف کپڑے پہنے
اور جاکر نماز جماعت میں شریک ہو گئے۔ چاہے پہلی صف ہو۔ آخر
صف ہو۔ اُن کو کوئی منع کرنے والا نہیں ہے کہ تم آکر علما کے ساتھ
کیوں بیٹھے۔ اُن کے لئے یہ نہیں ہوتا کہ تم ہمارے قریب نہ بیٹھنا
بالکل مساوات کوئی تفریق نہیں۔ یہ ہے اسلام کی تعلیم۔ یہ ہے
اسلام کی ہدایت۔ وہ بھی درحقیقت ایک رکن ہیں اس نظام حیات کے

جسپر دنیا قائم ہے۔ درحقیقت آپ اُنکے بھی دست نگر ہیں۔ ممنون احسان ہیں۔ اگر کوئی آپکے بہت سے ضروریات پورے کرتا ہو تو اُس کو ذلیل نظروں سے نہ دیکھیے۔ اگر ان لوگوں کا وجود نہ ہو تو آپکی حیات قائم نہیں رہ سکتی۔ تمام افراد انسان مثل اعضائے بشری کے ہیں۔ تمام افراد ایک جسم کے اعضاء ہیں۔ ان اعضاء میں جس طرح سے قدرت نے تقسیم عمل کی ہے۔ ہاتھ ہیں۔ پیر ہیں آنکھیں ہیں۔ ہر ایک کے فرائض الگ الگ ہیں ہر ایک کی منزل الگ الگ ہے۔ نظام زندگی کے اعتبار سے ہر ایک کا کام اُسکے ذمہ ہے دوسرا اُسمیں مزاحمت نہیں کرتا۔ کوئی ایک عضو انسان کا دوسرے کو ذلیل نظر سے دیکھنے کا حقدار نہیں ہے۔ پاؤں میں لگا ہوا کانٹا ہاتھ ہی سے نکلے گا۔ ہاتھ بلند ضرور ہے۔ لیکن ضرورت پڑے گی تو ہاتھ کا کام پاؤں سے اور پاؤں کا کام ہاتھ سے نکلے گا۔ اتحاد عمل ہے شیرازہ اجتماعی یوں منظم ہوتا ہے۔

اسی طرح سے یہ تمام شعبے جو انسانی زندگی کے ہیں۔ اُسکی تقسیم ضرور ہے کسی سے کوئی کام متعلق ہے اور کسی سے کوئی کام لیکن کسی کو اُسکے پیشہ کی وجہ سے ذلیل نظر سے نہ دیکھئے جس طرح سے بہت سی باتوں میں وہ آپکے دست نگر ہیں اسی طرح سے بہت سے

کاموں میں آپ اُنکے دست نگر ہیں۔ تو آپ کو کیا حق ہے اس کا کہ آپ حقارت سے دیکھئے۔ اُن کو آپ نگاہ ذلت سے دیکھیے۔ کسی پیشہ والے کو ذلت سے دیکھنے کا حق آپ کو اسلام کی طرف سے نہیں ہے۔ اصحاب ائمہؑ کیسے کیسے افراد تھے یہ اصحاب ائمہؑ کوئی معمولی ہستیاں نہیں ہیں وہ وہ ہیں کہ احکام شرعیہ انہی کے ذریعہ سے آپ کو پہنچے ہیں۔ درحقیقت وہی فقہا تھے حرام حلال جاننے والے۔ ہم کو تو سنے سنائے اُنہی کے ذریعہ سے فیوض پہونچے ہیں جو ائمہ کی طرف سے اُن کو پہونچے تھے۔ لیکن اگر آپ دیکھئے تو آپ کو ملے گا کتب رجال میں "جمال" اُونٹ چلانے والا" کسی کے نام کے ساتھ آپ کو ملیگا "تمار" کسی کے نام کے ساتھ "براز" کسی کے نام کے ساتھ ملیگا "دہّان" جس کو آپ اپنے پست الفاظ میں "تیلی" کہتے ہیں۔ کسی کے نام کے ساتھ ملے گا "طحان" آٹا بیچنے والا" کسی کے نام کے ساتھ ملے گا "بقال" یعنی سبزی بیچنے والا اس طرح مختلف افراد کے ساتھ آپ کو مختلف نام ملیں گے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب لوگ دن بھر دوکان پر بیٹھے تھے کسب معیشت کرتے تھے جس وقت فرصت ہوتی تھی جا کر علوم ائمہ کو حاصل کرتے تھے یہی افراد ہیں جن کی عملی سیرت ہمارے لئے قابل قدر رہی۔ قابل پیروی ہے۔ ائمہؑ نے اُن کو احکام تفویض کئے۔ اگر کسی نے تجارت کو چھوڑ دیا۔ پوچھا کیوں

چھوڑ دیا۔ ضرور تجارت شروع کرو۔

اسلئے کہ باز رہنا تجارت سے اور ترک کرنا عمل شیطان سے ہے۔
تو ایک مساوات قائم ہے کسی کو اسکے پیشہ کی جہت سے ذلیل نظر
سے نہ دیکھیے۔ کوئی اپنے کو دوسرے کے مقابلہ میں بڑا متقی پرہیزگار نہ سمجھے
بے شک ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم تم میں سب سے زیادہ معزز ہے
جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو لیکن اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک شخص
جو معاصی سے پرہیز کرتا ہے دوسرے کو اپنے مقابلہ میں حقیر نظر سے دیکھے
کہ میں اس سے زیادہ متقی ہوں۔ وہ تقویٰ اسکے لئے وبال اُخروی کا
سبب بن جائے گا۔

یہ تو قدرت کی نظر میں ہے کہ جو اتقی ہوگا وہ معزز ہوگا۔ مگر کسی
انسان کو حق نہیں ہے کہ وہ اپنے کو اتقی سمجھ کر دوسروں کو حقارت
سے دیکھے۔ اسلئے کہ باطن کا علم خدا کو ہے۔

آپ اس بات پر نہ جائیے کہ میں نے بہت نمازیں پڑھی ہیں روزے
رکھے ہیں۔ دوسروں سے اپنے کو بہتر سمجھوں۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر شخص
مجھ سے بہتر ہے اگر ایسا جذبہ پیدا ہو جائے تو درحقیقت گھمنڈ اور غرور کا
وجود دنیا میں نہ رہ جائے۔ لا یسخر قوم من قوم کوئی جماعت دوسری
جماعت کا تمسخر نہ کرے۔ مذاق اور چیز ہے۔ تمسخر اور چیز ہے۔ فرق یہ ہے

کہ مذاق میں کسی کی اہانت منظور نہیں ہوتی مسخرہ بنانے میں اہانت شریک ہوتی ہے۔ مذاق حد جائز میں ہو تو مزاح میں داخل ہے۔ مزاح المومنین خیر۔ لیکن وہاں تک کہ حد اعتدال میں رہے۔ تمسخر وہ ہے جس کے لئے ارشاد ہوتا ہے۔ کہ کوئی آدمی کسی دوسرے کا تمسخر نہ کرے آپ کو کیا معلوم شاید وہ آپ سے بہتر ہو۔

ولا نساء من نساء عسیٰ ان یکن خیرا منھن اور نہ عورتوں کو حق ہے کہ وہ دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں۔ کیا معلوم وہ بہتر ہوں اپنے عمل میں ولا تنابزوا بالالقاب اور مختلف القاب نہ رکھ لو پکارنے کیلئے۔ جیسے اکثر دوسروں پہ پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔ نام ایسے رکھتے ہیں جو برے معلوم ہونے کے قابل ہوں۔ ایسا نہ کرو۔ میں نے عرض کیا کہ معصوم نے تعلیم دی بڑے چھوٹوں کو اپنے سے بہتر سمجھیں چھوٹے بڑوں کو بہتر سمجھیں۔ برابر والے برابر والوں کو اپنے سے بہتر سمجھیں اگر یہ چیز پیدا ہو جائے تو پھر دنیا میں تنافر باہمی کا پتہ نہ لگے شکوہ وشکایت کا وجود نہ رہے۔ یہ کیا ہے کہ ہمارے کسی مزعومہ معیار عظمت میں کمی ہوئی۔ اور ہماری تیوریوں پر بل آگئے۔ چاہے دوسروں کے حق میں ہم نے کتنی ہی فروگذاشت کی ہو۔ مگر ہماری تعظیم کے لئے اگر کوئی نصف قد سے کھڑا ہو تو برا معلوم ہوگا۔ مگر خود ہم نے اپنے طرز عمل کا

جائزہ کبھی نہیں لیا کہ ہم تو کبھی کسی کے ساتھ کمی نہیں کرتے ؟

امیر المومنین ع نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔ اجعل نفسك میزانا فیما بینك و بین غیرك۔ اپنے نفسوں کو معیار قرار دو۔ اپنے اور اپنے غیر کے درمیان۔ اپنے نفس کو ترازو بناؤ۔ اپنے اور غیر کے معاملات میں۔

فاحبب لغیرك ما تحب لنفسك غیر کے لئے اسی بات کو محبوب سمجھو جس کو اپنے نفس کے لئے محبوب سمجھتے ہو۔

واکرہ له ما تکرہ لها۔ اور ناگوار سمجھو غیر کیلئے جسکو اپنے لئے ناگوار سمجھتے ہو ولا تظلم کما لا تحب ان تظلم دوسروں پر ظلم نہ کرو جس طرح یہ نہیں چاہتے ہو کہ کوئی تم پر ظلم کرے۔ واحسن کما تحب ان یحسن الیك دوسروں کے ساتھ اچھائی کرو جس طرح چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ اچھائی کریں واستقبح من نفسك ما تستقبح من غیرك جس چیز کو غیر کے لئے معیوب سمجھتے ہو اُسے اپنے لئے بھی معیوب خیال کرو وارض من الناس بما ترضاہ لهم من نفسك دوسروں سے اپنے لئے اُتنے ہی طرز عمل پر راضی ہو جاؤ۔ جتنے طرز عمل پر تم غیر کے ساتھ اپنی طرف سے راضی ہوتے ہو یعنی تم خود جتنا برتاؤ غیر کے ساتھ کر سکتے ہو اور کافی سمجھتے ہو۔ اُتنے ہی کو کافی سمجھو غیر کی طرف سے اپنے لئے

یہ تعلیم ہمارے سامنے موجود ہے مگر ہم کو کبھی توجہ نہیں ہوتی کہ ہم اپنے اعمال و افعال کو پرکھیں کہ کہاں تک وہ معیار صحیح پر ہیں۔ ہماری نظر دوسروں کے افعال پر بہت جلد پڑتی ہے۔ کبھی ہمیں اس امر پہ غور کرنیکی توفیق نہیں ہوتی کہ کہیں ہمارے طرز عمل میں تو وہ قابل اعتراض چیز نہیں پائی جاتی اگر انسان اپنے نفس پر توجہ کرے۔ تو اسکی نظر غیر پر جائے ہی کیوں۔ اُسے اپنے ہی سے فرصت نہ ملے۔

مومن کے لئے ارشاد فرماتے ہیں نفسہ منہ فی عناء والناس منہ فی راحۃ دنیا اسکی طرف سے چین اور آرام میں ہے مگر اسکا نفس خود ایک شکنجہ میں مبتلا ہے وازنوا انفسکم قبل ان توزنوا تولو اپنے نفس کو قبل اسکے کہ تولنے کا وقت آئے"۔ لیکن ہمارا تو یہ کام ہے کہ ہم کسی جگہ بیٹھیں تو یہ نقل محفل ہے کہ دوسروں پر اعتراض کریں۔ دوسروں کی اچھائیوں سے چشم پوشی کرنا اور دوسروں کی برائیوں کو نمایاں کرنا۔ یہ چیزیں وہ ہیں جن سے ہیئت اجتماعی میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ اسلام نے اسکو منع کیا لا یغتب بعضکم بعضا ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتا فکرھتموہ۔ کبھی تم میں سے کوئی دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائی کرنے کی جرأت نہ کرے۔ کیا تم اسکو پسند کرتے ہو کہ تم اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھاؤ"

جیسے کوئی مردہ ہو اُسکو خبر نہیں اگر اُسکا گوشت کوئی کھائے ویسے ہی کسی کی غیبت میں برائی کرنا۔ ایک دوسرے کی دل آزاری کرنا۔ ایک دوسرے کا دل دکھانا۔ اسکو بڑی معصیت قرار دیا ان الذین یؤذون المومنین والمومنات بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بھتانا و اثما مبینا۔ وہ لوگ جو ایک دوسرے کو اذیت دیتے ہیں ناحق اُنھوں نے بڑی معصیت کا ارتکاب کیا۔ خدا کی طرف سے اسکو "اثم مبین" یعنی "کھلا ہوا گناہ" کہا جا رہا ہے۔ کہا "مومن کا دل ہماری جائے نزول اجلال ہے۔ اگر مومن کے دل کو تکلیف پہونچی تو اُس سے مجھکو تکلیف ہوگی۔ مومن کے دل کو اپنی فرودگاہ بتایا۔

فرمایا لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب عبدی المومن ارض و سما میں میرے لئے وسعت نہیں ہے۔ مگر مومن کے دل میں میرے لئے وسعت ہے" یہ آپس کے اختلافات کا سد باب کرنا تھا۔

امیر المومنینؑ ارشاد فرماتے ہیں تلافیک ما فرط من صمتک ایسر من ادراکک ما فات من منطقک۔ خاموش رہنے میں اگر کوئی مقصد فوت ہوتا ہے تو اُس کا تدارک آسان ہے اُس خرابی کے تدارک سے جو بات کہ ڈالنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے"۔

یہ زبان! اگر اسکو کسی ایسے کلمہ سے جو کسی دوسرے کے دل میں ٹھیس لگنے کا باعث ہو۔ انسان روکے رہے تو کاہے کو دنیا میں منافرت پیدا ہو۔ ایک طرف یہ ممانعت کہ خبردار! تمھاری طرف سے کسی کا دل نہ دکھنے پائے۔ کسی کو ایذا نہ پہونچنے پائے۔ ایک طرف یہ حکم کہ کسی کی حاجت کو پورا کر دینا۔ ستر برس کی عبادت کے برابر ہے آپس میں ایک دوسرے کی خدمت کرنا یہ وہ چیز ہے جو بہتر سے بہتر عبادت قرار دیگئی ہے۔

امام طواف میں مصروف تھے ایک شخص آتا ہے اور کچھ عرض کرتا ہے آپ طواف کو قطع کر کے اُسکے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ واپس آنے پر طواف کو پورا کرتے ہیں۔

ایک دوسرا شخص پوچھتا ہے کہ آپنے طواف تمام نہیں فرمایا؟ فرماتے ہیں۔ ایک بندہ مومن کی ایک حاجت تھی مجھکو اچھا معلوم ہوا کہ طواف سے قبل اسکی حاجت پوری کر دوں"۔

مگر ہم کو تو اس سے مطلب ہے کہ ہمارے لئے راحت و آرام ہو۔ دوسرے چاہے مشقت میں بسر کریں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تمام افراد بمنزلہ فرد واحد کے ہیں۔ انسان کے تمام اعضاء و جوارح رعایا ہیں دل متمکن کیا گیا ہے عرش حکومت پر۔ اس جسم کی مختصر مملکت میں۔

تمام اعضاء و جوارح اس کے لئے تابع فرمان ہیں۔ ذرا نگاہ ڈالئے اعضاء کے باہمی ارتباط پر۔ ایک کانٹا اگر کسی پاؤں کے انگوٹھے میں لگتا ہے تو تمام اعضاء بے چین ہو جاتے ہیں۔

یہی سپرٹ کیوں نہیں ہوتا۔ کہ اگر ایک پر کوئی مصیبت پڑے تو نوع بشری پر اثر ہو جائے اسلام نے یہی تعلیم دی کہ درحقیقت دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت سمجھو۔ دوسرے کے درد کو اپنا درد سمجھو اپنی حاجت کو روک دو۔ دوسرے کی حاجت کو پورا کرو۔ یؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ "مقدم کرتے ہیں دوسروں کو اپنے نفس پر۔ اگرچہ خود اپنے کو ضرورت ہو"۔

یہ ایثار یعنی دوسروں کو اپنے اوپر مقدم کرنا۔ یہی وہ خاص چیز ہے جو اسلامی تعلیم کا جوہر ہے۔ جب نقش اسلام تازہ تھا۔ گرد و غبار نہیں آنے پایا تھا۔ مسلمانوں کے طرز عمل میں اس تعلیم کے نمونے پائے جاتے ہیں جو رسولؐ اور آل رسولؐ کی طرف سے ملی تھی۔ جنگ یرموک کا واقعہ تاریخوں میں درج ہے۔ مسلمانوں کے لشکر میں کوئی آدمی زخمی ہو کر گرا ہے۔ پیاس کا غلبہ ہے۔ ایک شخص کسی اپنے عزیز کے لئے پانی لیکر پلانے جاتا ہے۔ ایک دوسرا زخمی پانی کی طرف دیکھنے لگتا ہے وہ پہلا کہتا ہے کہ پہلے اسے پانی پلاؤ۔ یہ اُسکی طرف پانی لیکر

جاتا ہے تو تیسرا زخمی نظر پڑ جاتا ہے۔ اُس کی نظر بھی اسی جام آب پر
ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ پہلے اس کو پانی پلا دو۔ اسی طرح چار آدمی
پڑے ہوئے ملتے ہیں۔ جب چوتھے کے پاس پہونچتا ہے تو اُس کی
روح مفارقت کر جاتی ہے۔ تیسرے کے پاس آتا ہے وہ بھی اپنی
جان دے چکتا ہے۔ دوسرے کے پاس آیا اسکا بھی جسم سرد ہو چکا
تھا۔ اور اسی طرح پہلا شخص بھی تشنہ لب دنیا سے رخصت ہو گیا
یہ مسلمانوں کا وہ طرز عمل ہے جو تازہ تازہ اُن میں موجود تھا جس پر
ابھی مادیت کا گرد و غبار نہیں پڑا تھا جس پر امتداد زمانہ نے غفلت
کے پردے نہیں ڈالے تھے

اب ہم میں سے کتنے افراد ہوں گے جو اس طرز عمل کے پابند ہو سکیں گے
ہمارے یہاں تو یہ ہے کہ کسی ایسے سخت موقع کا ذکر نہیں، جب کوئی
ضیق نہ ہو۔ کوئی شدت نہ ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ چاہے دوسرے کا
گلا کٹ جائے مگر ہم منافع حاصل کر لیں۔ بلکہ ہم میں بہت سے ایسے
افراد ہیں کہ اگر کوئی فائدہ پہونچتا ہو دوسرے کو تو چاہے ہمیں وہ
نہ ملتا ہو۔ مگر ہم دراندازی کریں گے کہ اُسکو یہ فائدہ نہ پہونچنے پائے
اگر ہمارے اسلام کی یہ حالت ہے تو ہم جس حد تک تنزل نہ کریں تھوڑا
ہے۔ ہمارے درمیان میں وہ اخوت باقی نہ رہی جس کو اسلام نے روح حیات

قرار دیا تھا انما المومنون اخوۃ جس پر اپنا احسان جتایا تھا۔ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اوس خزرج کے خون کے پیاسے تھے۔ خزرج اوس کے گلے پر تلوار چلانے پر تیار تھے اسلام نے ان اختلافات کو مٹا کر ایک نقطۂ اخوت پر مجتمع کیا۔ لیکن ہم؟ ہماری حالت تو یہ ہے کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے۔ اور ایک دوسرے کو پامال کرنے کے لئے تیار ہے۔ ہم زبان سے مسلمان ہیں۔ مگر اسلام کے نقش کو محو کر رہے ہیں ہم کہتے ہیں کہ ہم ترقی نہیں کرتے۔ آپ سب لوگوں کا خیال ہوگا کہ اسلام مانع ترقی ہے۔ یہ ہمارے طرز عمل کا قصور ہے کہ اسلام کو مانع ترقی ثابت کریں۔ اگر اسلام اپنی حالت پر قائم رہتا۔ تو ترقی ہمارے دم قدم سے وابستہ رہتی۔ ہمارے سامنے بہتر سے بہتر تعلیمات موجود ہیں۔ ہمارے سامنے رسولؐ کے اسوۂ حسنہ میں اہلبیت طاہرین کی سیرتیں ہیں۔ کربلا کا عظیم الشان تاریخی واقعہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ جس نے ہر قسم کے تعلیمات ہمارے سامنے پیش کئے۔ مواخات کا سبق۔ ایثار کا سبق۔ سال گذشتہ کے دس دن کے بیانات میں مستقل طور سے موضوع "اسوۂ حسینی" تھا۔ اس کو تفصیل سے عرض کیا گیا تھا۔ آج ہم منافع میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے

ہیں۔ مجالس کے حصوں میں آپ دیکھ لیجئے۔ ایک دوسرے پر سبقت کرنا چاہتا ہے چاہے دوسرے کو تکلیف ہی پہنچ جائے۔ لیکن ہم ہی پہلے نکل جائیں اور مجلس کا حصہ حاصل کر لیں۔ لیکن اگر خطرہ کا وقت ہو تو ہر ایک پیچھے ہٹنا چاہے گا۔ دیکھ لیجئے۔ آج مجالس میں جو سب سے پہلے حصہ لینا چاہتے ہیں وہ مجلس کی نشست میں سب سے موخر ہوتے ہیں اسلئے کہ منبر کے قریب بیٹھنے میں گرمی معلوم ہوتی ہے اور مجمع کی کشمکش ہوتی ہے۔ یہاں ایک دوسرے پر سبقت نہ کریگا کہ ہم ہی ذاکر کے سب سے زیادہ قریب ہوں۔ اس میں ہر ایک قدم پیچھے ہٹائے گا لیکن حصہ میں سبقت ضرور ہوگی۔

یاد رکھئے کربلا کے واقعہ میں سلاح جنگ تھے موت تھی جس میں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ واقعات مجھے بیان کرنا نہیں ہیں۔ واقعات تو آپکے سامنے ہی ہیں۔ مجھے صرف یاد دلا کر اسکے نتیجہ کی طرف متوجہ کرنا ہے، وہ ایثار کا سبق۔ وہ ہمدردی کا سبق۔ اُن کے پیش نظر یہ تھا کہ کم از کم وقت کے لئے بھی ہم دوسرے کو محفوظ رکھ لیں اور اپنی جان دیدیں۔ انجام سب ہی کے پیش نظر تھا۔ کون سمجھتا تھا کہ ہم چلے گئے تو دوسرے محفوظ رہ جائینگے لیکن یہ تھا کہ جبتک ہم ہیں دوسرا نہ تلف ہو جتنی دیر کے لئے بھی ہو

ہم دوسرے کو محفوظ کر لیں خود اپنی جان دیدیں۔ یہ صورت عمل ہمارے سامنے پیش کی گئی۔ لیکن ہم آنکھیں کھولکر نہیں دیکھتے۔

مسئلہ غلامی

اس مساوات کے خلاف جو میں پیش کر رہا تھا۔ سب سے بڑا الزام جو پیش کیا جا سکتا ہے اسلام پر۔ وہ غلامی کا مسئلہ ہے۔ لیکن درحقیقت بے خبر ہیں وہ تاریخ کے حقائق سے۔ لاعلم ہیں وہ جو اسلام کی غلامی کو اس کی مساواۃ کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے نہیں سمجھا غلامی کو اسلام کی جنھوں نے غلامی کو اسلام کی مساواۃ کے خلاف قرار دیا۔ ہمکو غلامی کا صحیح مفہوم جو اسلام نے پیش کیا جس کو اپنی تعلیم کی روشنی میں ہمکو دکھلایا۔ اگر دیکھنا ہے تو سیدہ عالمؑ کے گھر پر جائیں اور فضہ سے دریافت کریں کہ تمھارے ساتھ تمھاری شاہزادی کا کیا برتاؤ ہے؟ اس گھر کی کنیز یہ جواب دے گی کہ ایک دن گھر کا کام میں کرتی ہوں اور ایک دن ملکۂ خانہ کرتی ہیں۔

اسکے معنی یہ ہیں کہ درحقیقت غلامی غلامی نہ تھی۔ وہ لوگ افراد خانہ میں داخل کر لئے جاتے تھے۔ کون نہیں جانتا کہ سلمان غلام تھے وہ سلمان جن کے نام کی عظمت کے سامنے اسوقت ہمارے دل لرزتے ہیں

جن کے متعلق یہ ارشاد کیا گیا ہے کہ ایمان کے دس درجے ہیں۔ نو درجوں
پر سلمان فائز ہیں۔ علم اول کو بھی جانتے تھے۔ علم آخر کو بھی حاصل کیا
تھا جن کے متعلق ہر ایک معزز کو یہ شکایت تھی کہ رسول کی بارگاہ میں
اُن کی منزل ہم سے آگے ہے۔ جن کے متعلق واقعات ہمارے سامنے
تاریخوں میں پیش نظر ہیں کہ سلمان ایسے ایسے وقت میں رسول اللہؐ
کی خدمت میں پہونچتے تھے کہ دوسرا انہیں پہونچا۔ وہ سلمان درحقیقت
خریدکردہ تھے۔ رسول اللہؐ نے اُن کو خرید کیا تھا۔ جو خرید کیا جائے
وہ غلام نہ ہوا تو اور کیا ہوا۔ پھر آزاد کر دیا تھا۔ اُنکی منزل وہ تھی
کہ اہلبیت میں داخل کر لئے گئے۔ سلمان منا اهل البیت۔
امام جعفر صادقؑ کے سامنے کسی نے سلمان فارسی کہدیا۔ حضرت کا
چہرہ متغیر ہو گیا۔ کہا سلمان فارسی نہ کہو۔ سلمان محمدیؐ کہو۔ بلال
غلام تھے اور حبشی غلام تھے۔ میں نے عرض کیا کہ مؤذن کا عہدہ
عطا کیا گیا تھا۔ پہلو بہ پہلو بیٹھتے تھے۔ ہمارے پیش نظر ہیں یہ
روایات کہ بعد وفات رسولؐ انھوں نے مدینہ چھوڑ دیا تھا۔ کہ میں
اُس شہر میں اب نہ رہوں گا جس میں رسولؐ نہ ہوں۔ شام چلے گئے
تھے رسولؐ کو خواب میں دیکھا۔ کہ آپ فرماتے ہیں کہ " اے بلال تم
اب ہماری قبر کی زیارت کو بھی نہیں آتے " بلال زیارت قبر رسولؐ

کے لئے آئے۔ اس موقعہ پر ہے کہ حسنینؑ نے چچا کہکر خطاب کیا۔
اور وہ خاص منظر تھا جب بلال نے اذان دی ہے تو مدینہ میں
انقلاب عظیم برپا تھا۔

یہ ایک غلام کی شخصیت ہوتی ہے۔ آپ کے سامنے وہ واقعہ پیش
ہوا کرتا ہے کہ جناب سید الشہداءؑ نے سلام کیا تھا فضہ پر بھی جس طرح
سب پر سلام کیا تھا۔

جون غلام ابوذر غفاریؓ۔ جب رخصت کیلئے آئے ہیں جسطرح
عزیزوں کو روکا تھا۔ ان کو بھی روکا گیا۔ لیکن وہ حق شناس تھے عرض کیا
کہ آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ یہ کہا تھا کہ میرا رنگ سیاہ ہے۔ میرے
خون میں بو آتی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ میں آپ کے دامن سے تمسک
چاہتا ہوں کہ صحیح آزادی کے حق کو حاصل کروں۔ جس سے اسلام نے
غلام کو بھی محروم نہیں رکھا۔

آپ کو معلوم ہے کہ جب وہ گئے ہیں تو امام حسینؑ نے کیا برتاؤ کیا
تھا۔ شاید تمام اصحاب کے بھی رخسارہ پر رخسارہ نہ رکھا ہوگا لیکن غلام
کے رخسارہ پر رخسارہ رکھدیا تھا۔

اسلام نے غلامی کو ایک نعمت قرار دیا۔ ان کے ساتھ ائمہ کرام کا
طرز عمل۔ امام زین العابدینؑ کی کنیز کا واقعہ بھی آپ کے سامنے پیش ہوتا رہتا ہے

حضرت تشریف فرما تھے۔ کنیز گرم شوربہ لیکر آئی ہاتھ سے چھوٹ گیا اور حضرت کے پاؤں پر گرا۔ حضرت نے بس ایک نگاہ ڈالی مگر جرم کے احساس سے دل اُسکا لرز رہا تھا۔ اُس نے کہا (چونکہ افتاد طبع معصومین معلوم تھی) والکاظمین الغیظ غصّہ کے روکنے والے۔ آپنے فرمایا۔ کظمت غیظی "اچھا میں نے روکا اپنے غصّہ کو" والعافین عن الناس "اور عفو کرنے والے لوگوں کے" حضرت نے فرمایا "میں نے تجھے معاف کیا" اُس نے کہا واللہ یحب المحسنین آپنے فرمایا "میں نے راہ خدا میں آزاد کر دیا"

ایک شخص نے امام سے عرض کیا کہ آپکے غلام آلیس میں تذکرہ کرتے ہیں کہ آپ کا کوئی رعب اُن کے دلوں پر نہیں ہے۔ تو آپنے سجدۂ شکر ادا کیا فرمایا "میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُسکے بندے مجھ سے ڈرتے نہیں۔ یہ طرز عمل تھا۔ یہ طریقہ تھا۔ تو کیا ایسی غلامی مساوات کے خلاف ہے؟

اسکا نتیجہ یہ تھا کہ غلام درحقیقت اپنے مالک کو بار خاطر نہ سمجھتے تھے۔ یہ غلام درحقیقت فرزندوں کی طرح رہتے تھے۔ غلام کا نام بدنام ہے مگر اچھائی اور برائی حقیقت سے تعلق رکھتی ہے تو اسلام کی غلامی دوسرے اقوام کی آزادی سے بہتر ہے۔ اسی طرح ہر چیز میں مساوات

امیر المومنینؑ (قنبر آپ کے ساتھ تھے) تشریف لے گئے بازار میں۔ ایک کپڑا خریدا گیا سات درم کا۔ اور ایک ۵ درم کا۔ سات درم والا کپڑا قنبر کو دیا گیا۔ پانچ درم کا لباس خود زیب جسم کیا۔ قنبر نے عرض کیا کہ یہ لباس آپ زیب جسم فرمائیے۔ آپ نے جواب دیا۔ (جیسے بچوں کو جواب دیا جائے) قنبر! تم نوعمر ہو۔ تمھارے لئے یہی لباس بہتر ہے میں یہ لباس نہیں لوں گا۔

جو لوگ حلقۂ معرفت الٰہی میں آجائیں اور اسلامی جامعہ میں مندرج ہو جائیں اُن کے لئے غلامی کا سد باب ہو جاتا ہے مسلمان کو غلام بنانے کا کسی کو حق نہیں۔ جو غلام ہیں اُن کی آزادی پر بھی ایسے بیش قیمت ثواب کا اعلان کیا کہ اگر حقیقتاً کوئی پابند شریعت ہو تو اس اعلان پر یقیناً غلام کو آزاد کرنے پر متوجہ ہو جائیگا۔ جس نے ایک غلام کو آزاد کیا اُس نے گویا ایک نفس کو زندہ کیا۔ جس نے ایک غلام کو آزاد کیا۔ اُس نے گویا ستر برس خدا کی عبادت کی۔ خاص طریقوں سے غلاموں کی آزادی کا اعلان کیا۔ درحقیقت اسلام اُس غلامی کا جو مساوات کے لئے عار و ننگ ہو حامی ہو کر نہیں آیا۔ اسلام آزادی کا علم اٹھا کر آیا تھا اور خداوند عالم نے اسلامی قانون کے ذریعہ سے دنیا میں مساوات کی عمارت قائم کی کہ کسی شخص کو حق نہیں ہے کہ دوسرے کو حقارت کی نظر

سے دیکھے۔

مسلمانوں کی زندگی غیر اقوام کے ساتھ

وہ لائحہ عمل جو مسلمانوں کے لئے غیر اقوام کے ساتھ اختیار کرنے کے متعلق اسلام نے مقرر کیا ہے اور جس طرح رواداری کا ثبوت دیا ہے اُس کا تذکرہ خود ایک طویل الذیل موضوع ہے۔ جسے اس مختصر وقت میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا ہمیشہ کسی بات کے سمجھنے میں نقطۂ حقیقت تک نہیں پہونچا کرتی اسلئے اکثر لوگوں نے یہ غلط خیال قائم کر لیا کہ اسلام دوسروں کے ساتھ دوستی کا حامی نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف غیر مسلم اسلام پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ اسلام امن و امان کا دشمن ہے! اور دنیا میں فتنہ و فساد برپا کرنا اسلام کا کام ہے، دنیا کی خاموش فضا کو انقلاب سے تبدیل کرنا یہ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ دوسری طرف خود مسلمان اسلامی تعلیم سے بے خبر ہونے کی وجہ سے سخت سے سخت طرز عمل کو جو مذہب کے نام سے دوسروں کے مقابلہ میں اختیار کیا جائے اسلامی خدمت سمجھکر کرنے لگے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے امن و امان کو حقیقۃ ٹھیس لگتی ہے اسلئے ضرورت ہے کہ ہم واقعی اسلام کے تعلیمات پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ درحقیقت اسلام نے

غیر مسلمین کے ساتھ کیسے طرز عمل کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے عملاً اس نے خود کس حد تک رواداری سے کام لیا ہے۔

میں مستقل طور سے گذشتہ دس مجالس میں جو منعقد ہوئی تھیں چار روز تک اسلام اور رواداری کے موضوع پر عرض کر چکا ہوں۔ میں نے جناب رسالتمآب اور اہلبیتؑ کے اسوۂ حسنہ اور طرز عمل سے یہ دکھلا دیا کہ اسلام کس طرح سے امن و امان کا حامی ہے۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اسلام شروع سے آخر تک ابتدا سے انتہا تک صلح و آشتی کا پیغام ہے امن و امان کا علمبردار ہے۔ اس نے خود اپنے لئے نام "اسلام" کا اختیار کیا جو "سلم" سے مشتق ہے اور "سلم" کے معنی "صلح" کے ہیں۔ دوسری چیز جو اسلام کے ساتھ ساتھ طرۂ امتیاز قرار دیکھی وہ "ایمان" ہے اور ایمان "امن" سے قرار دیا گیا جس کے معنی ہیں "امن و امان"۔ یعنی مسلمان وہ ہے جو صلح پسند ہو۔ اور مومن وہ ہے جو امن پسند ہو۔ صلح و آشتی اس کے نام کا جز قرار دیا گیا۔ اس نے آپس کے برتاؤ میں آداب و قواعد قرار دئے جن سے حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ حکم ہے کہ ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان سے جب ملاقات ہو تو کہے "سلام علیکم ورحمۃ اللہ" اس طرح اپنی صلح پسندی کے جذبہ کا اظہار کرے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم تعلیمات اسلام سے بے خبر ہو گئے اس رسم کو بھی ترک کر دیا۔ ہم میں وہ ظاہری

رسم بھی باقی نہیں رہی۔ لیکن اسلام کی تعلیمات برابر ان خاص خزانوں میں جو ان کے ماننے والوں میں محفوظ ہیں اور وہ ہمارے سامنے پیش نظر ہیں۔ اس شعبہ میں کہ اسلام نے دوسرے مذہب کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا ہے میری نظر سب سے پہلے اسلام کے ان تعلیمات پر پڑتی ہے جو دوسرے مذاہب کے بنیادی عقائد کے ساتھ اسلام نے ظاہر کیے ہیں۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام نے دنیا کے کسی مذہب کو جو درحقیقت مذہب کی حیثیت رکھتا ہو۔ اصولی طور سے، بنیاد کے اعتبار سے باطل نہیں کہا یہ پہلی رواداری ہے اسلام کی غیر مسلموں کے ساتھ۔ یعنی ایک صورت یہ تھی کہ اسلام دنیا میں اگر یہ اعلان کرتا کہ یہودیت بے حقیقت چیز ہے نصرانیت باطل ہے۔ دوسرے مذہب جو ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ تو یہیں سے بنائے مخاصمت قائم ہو جاتی۔ یہیں سے اسلام کے خلاف دوسرے لوگوں کے دلوں میں جذبات عناد پیدا ہونے کا حق پیدا ہو جاتا۔ لیکن جب ہم اسلامی تعلیمات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے کسی مذہب کو اسکے اصل اصول اور بنیاد کے اعتبار سے باطل قرار نہیں دیا۔

آپ قرآن مجید کا مطالعہ کر ڈالیے شروع سے آخر تک۔ اور دیکھ ڈالیے کہ اسلام نے کسی مذہب کو باطل کہا ہو یہاں ذرا میں مذہب کی اصطلاح کو

بتا تا چلوں۔ تاکہ میرے بیان میں جو اصل میرا مقصد ہے واضح ہو جائے
درحقیقت کچھ چیزیں تو وہ ہیں جو بطور طرز عمل کے مختلف اشخاص نے
اختیار کر لی ہیں۔ کچھ چیزیں ہیں جو بطور مسلک اور بطور سیرت کے کچھ
اشخاص نے اپنے لئے پسند کر لی ہیں۔ ان تمام چیزوں کو لغوی حیثیت سے
آپ مذہب کہہ سکتے ہیں یعنی جانے کا راستہ، وہ راستہ جس پر کوئی سالک ہو
وہی اسکا مذہب ہے۔ اس اعتبار سے تو بے شک بت پرستی بھی ایک
مذہب ہے۔ دہریت۔ الحاد۔ مادیت سب مذہب ہیں راستہ کے معنی
ہیں۔ مسلک کے معنی ہیں۔ رائے کے معنی ہیں۔ اس اعتبار سے تو کوئی بھی
انفرادی و اجتماعی راستہ جو کسی قوم یا شخص نے اختیار کیا ہو وہ مذہب سے
باہر نہیں ہے۔ لیکن جس اعتبار سے دنیا میں مذہب کی اصطلاح قائم ہوئی
ہے جس لحاظ سے آپ مذہب و لامذہبیت کا مقابلہ کرتے ہیں جس اعتبار
سے مادیت دہریت اور الحاد کو مذہب کا حریف مقابل قرار دیتے ہیں۔
اُسکے معنی یہ ہوئے کہ انسان کسی خاص شریعت کا پابند ہو۔ اور اُس
شریعت کو کسی سفیر الٰہی کے واسطہ سے خدا کی طرف منسوب کرتا ہو یہ معنی
ہیں مذہب کے۔ یہودیت ایک مذہب ہے۔ نصرانیت ایک مذہب ہے۔
بدھ مذہب ایک مذہب ہے۔ دوسرے ہندوں کے جو دھرم ہیں وہ بجائے
خود مذہب ہیں۔ زردشت کا مذہب ایک مذہب ہے۔ اس اعتبار سے

آپ مذاہب عالم کا شمار کرتے ہیں۔ اسلئے کہ وہ اپنے تئیں کسی رہنمائے روحانی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ جب اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو بت پرستی بحیثیت بتوں کے سامنے سر جھکانے کے کوئی مذہب نہیں ہی مشرکین قریش جو بتوں کے سامنے اپنا سر نیاز جھکاتے تھے انھیں اپنا خدا سمجھتے تھے اس کو انھوں نے کوئی شریعت و قانون نہیں قرار دیا تھا۔ بلکہ یہ اُن کا ایک ذاتی خیال تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم ان بتوں کی اس لحاظ سے پرستش کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا تک پہونچا دیں اُن کے ذریعہ سے ہم اسکی بارگاہ میں قریب ہونگے۔ یہ ایک طریق عمل ضرور تھا جو معین کر لیا تھا۔ لیکن اسکو اس معنی سے مذہب کہنا صحیح نہیں ہے جس معنی سے عیسائیت کو یہودیت کو مذہب کہتے ہیں۔

درحقیقت جتنے مذاہب عالم ہیں اسلام نے کسی کو صول اور بنیاد کے اعتبار سے باطل نہیں کہا کہ یہ مذہب غلط ہے یہ مذہب باطل ہے اسلئے کہ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے ایک سفیر الٰہی کی وساطت سے عیسائی اپنے کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں عیسیٰؑ کی وساطت سے۔ یہودی اپنے کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں موسیٰؑ کے واسطہ سے۔ ایران کے پارسی اپنے کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں زردشت کی وساطت سے۔ اسی طرح ہندوستان کے مختلف مذاہب اُن رہنماؤں کی

طرف سے جن کو وہ خدا کا فرستادہ بیان کرتے ہیں۔

ان مذاہب کو اصول و اساس کی حیثیت سے بے بنیاد کہدینے کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ اُس شخص کی نبوت سے انکار کر دیا جائے جس کی وجہ سے یہ خدا سے رشتہ جوڑتے ہیں۔ اگر کوئی موسیٰ کو بے اصل شخص کہدے تو یہودیت کی بنیاد منہدم ہو جائے گی۔

اسی طرح عیسائیت کا قلعہ بیخ و بن سے گر جاتا اگر اسلام عیسیٰ کے متعلق یہ کہتا کہ وہ خدا کے سفیر نہ تھے بلکہ ہمارے ایسے معمولی انسان تھے۔ مگر جب ہم قرآن مجید کا جائزہ لیتے ہیں۔ شروع سے آخر تک آیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بلا استثنا اسلام نے کسی مذہب کے متعلق یہ آواز نہیں بلند کی کہ وہ اصل اور بنیاد کے اعتبار سے باطل ہے۔ بلکہ اُس نے آواز بلند کی اور مجمل الفاظ میں کہا کہ تصدیق کرتا ہوں اپنے تمام پیشروؤں کی۔ اس طرح اُسنے رواداری کا سبق دیا۔ اپنے دائرہ عمل کو اس قابل قرار دیا کہ ہر مذہب والا اپنے اصل اصول مذہب پر قائم رہنے کے ساتھ مذہب اسلام کو تسلیم کرے (دوسرے لفظوں میں یہ عرض کر دوں)۔ اسلام اگر یہ کہتا کہ حضرت موسیٰؑ خدا کے پیغمبر نہ تھے تو یہودی اپنے مذہب کی عظمت کو اپنے دل میں جگہ دیتے ہوئے اسلام کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ اگر اسلام یہ کہتا کہ عیسیٰؑ دروغ گو تھے

تو عیسائی اپنے دلمیں عیسائیت کو جگہ دیتے ہوئے اسلام کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ مگر اسلام نے یہ اعلان کیا کہ میں کسی پیش رو کو کسی کے مقتدا کی ہستی کو اُس کی عظمت اور کمالات کو نبوت کے درجہ سے گرانے نہیں آیا۔ اُس نے کسی کے لئے یہ نہیں کہا کہ یہ غلط ہے اور باطل ہے۔ یا اسکی سچائی کسی طرح سے معرض انکار میں ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ قرآن مجید میں شروع سے آخر تک جب وقت ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ یہ جز ایسا ہے جس کو بار بار پیش کیا گیا ہے۔ یہ آخر ہے کیا کہ اس جزو کو بار بار پیش کیا جاتا ہے؟!

اگر ان تمام آیات کو پیش کیا جائے جس میں قرآن مجید نے دنیا کے سامنے یہ حقیقت پیش کی کہ میں اپنے پیش روؤں کی تصدیق کرتا ہوں۔ تو کلام بہت طویل ہو جائیگا۔ مگر جتنی وقت میں گنجائش ہے۔ کافۃ للناس بشیرا و نذیرا۔ بلا استثنا دنیا کے ہر مذہب کو دعوت دیجا رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کے آیات میں غور نہیں کرتے۔ اگر غور کریں تو جس حقیقت کو ہم واقعی سمجھیں وہ قرآن مجید میں مضمر نظر آئے گی۔

میں نے ابھی عرض کیا کہ اسلام نے ایک دائرہ اجتماعی ایسا قرار دیا جس میں ایک موسوی اپنے اُن تمام جذبات کے ساتھ اپنے اُن تمام

اعتقادوں کے ساتھ جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہیں۔ اسلام میں داخل ہو سکتا ہے۔ ایک عیسائی اُن تمام اعتقادوں کے ساتھ جو حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ بحیثیت نبوت و رسالت کے اسکو حاصل ہیں اسلام میں داخل ہو سکتا ہے۔

اسلام یہ کہتا ہے کہ تم میں سے ہر ایک باقی رہے اُن تمام عقیدوں پر جو تم کو اپنے رہنماؤں کے ساتھ حاصل ہیں۔ لیکن میں تمہارے سامنے ایک قانون اصلاح پیش کرتا ہوں کہ اس کو بھی قبول کر لو۔ پہلے کی نفی نہ کرو۔ لیکن اس جزو کو تسلیم کر لو۔ اگر یہیں پر سے انکار کا محل ہوتا تو (چونکہ نفی و اثبات جمع نہیں ہو سکتے) تصادم کی گنجائش تھی۔ جیسے مشرکین کے مقابلہ میں مسئلہ توحید میں "لا الہ الا اللہ" پہلے ہی جس چیز کو نمایاں کیا گیا وہ نفی ہے۔ وہ ٹکراتی ہے اُس بات سے جو اُسکے ذہن میں تھی لیکن مسئلہ نبوت میں اسلام نہیں کہتا لا نبی الا محمد رسولؐ کی زبان سے یہ نہیں نکلتا کہ لا رسول الا انا "کوئی رسول نہیں ہے سوائے میرے"۔ بے شک اگر ایسا ہوتا تو تمام ارباب عالم کے ساتھ منافرت و مخاصمت پیدا ہو جاتی۔ بلکہ اسکے خلاف قرآن مجید کہہ رہا ہے ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل نہیں ہے میرا بندہ خاص محمدؐ مگر ایک رسولؐ جسکے قبل بھی بہت سے

رسول گذر چکے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے معیار کو تمام پیشیروں کے ساتھ
مساوی قرار دے رہے ہیں جو پہلے گذر چکے ہیں اس طرح ہر ایک انسان
اُن تمام جذبات عقیدت کے ساتھ جو اپنے رہنماؤں کے ساتھ ہیں اسلام
کے جامعہ میں داخل ہو سکتا ہے اسکو دو لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے۔
وآمنوا بما انزلت مصدقا لما معکم سب اس میں داخل
ہیں "ایمان لاؤ اُس شے پر جو ہم نے اب نازل کی ہے تسلیم کرتے
ہوے اُن تمام چیزوں کو جو تمہارے پاس موجود ہیں تم کو کسی نقطہ پر
خط نفی کھینچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تم مانے جاؤ زردشت کو عیسیٰؑ کو مگر رسولؐ کو بھی تسلیم کر لو۔
ولما جاءهم کتاب من عند الله مصدق لما معهم وكانوا
من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاءهم ما عرفوا
کفروا به "جب انکے پاس آئی وہ کتاب جو تسلیم کرتی ہے تمام
اُن کتب کو جو اُن کے پاس ہیں اور اس سے قبل وہ خود امیدیں ظاہر
کرتے تھے اس کتاب کے متعلق۔ لیکن اب وہ انکار کرتے ہیں"
دیکھیے ایک چیز یہ تھی کہ وہ کسی چیز کا اثبات کرنے والے ہوں۔ اور
مذہب اسلام نفی کرتا ہو۔ تو یہاں مذہب اسلام کے جانب سے بنائے
مخاصمت قائم ہوتی ہے۔ اور ایک بات ہے کہ مذہب اسلام کسی کی بھی

نفی نہیں کرتا لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں مانتے۔ یہاں جو کچھ بنائے مخاصمت پیدا ہوتی ہے وہ اُدھر سے، اسلام پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا۔ البتہ اسلام کو یہ شکوہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ہم پیش کرتے ہیں اور یہ نہیں مانتے۔ واذا قيل لهم آمنوا بما انزل الله قالوا نؤمن بما انزل علينا ويكفرون بما وراءه وهو الحق مصدقا لما معهم وہی بنائے مخاصمت پیش کی جا رہی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ کوئی چیز پیش کرتے ہیں اور ہم نہیں مانتے۔

ارشاد ہوتا ہے "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ اُس پر جو خدا نے نازل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں بس! جو ہمارے اوپر نازل ہو چکا ہے ہم اُسی پر ایمان لاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ حق ہے اور تصدیق کرنے والا ہے اُن چیزوں کی جو انکے پاس ہیں۔"

یہاں دونوں پہلو پیش کر دئے۔ قرآن کا اقرار اُن ہستیوں اور شخصیتوں کے ساتھ جن کو وہ مانتے ہیں۔ اور ان کا انکار اس اصول سے جس کو اسلام پیش کر رہا ہے۔ اس کے بعد یہ کہا گیا کہ اُن کے سامنے اعلان کر دو کہ ہمارا یہ شیوہ نہیں ہے کہ ہم انبیا میں سے کسی کو تسلیم کریں اور کسی کو نہ کریں ہم تو سب کو تسلیم کرتے ہیں۔ تو ہم تم سے بھی یہی چاہتے ہیں۔ تم بھی سب کو تسلیم کر لو۔

ارشاد ہوتا ہے قولوا آمنا باللہ وما انزل الینا وما انزل الی
ابراہیم و اسمعیل و اسحق و یعقوب والاسباط وما اوتی موسی
وعیسی وما اوتی النبیون من ربھم لا نفرق بین احد منھم
ونحن لہ مسلمون۔

یہ آیت بنیاد ہے اُس تمام میرے بیان کی جس کو میں آپ کے سامنے
اسلامی رواداری کے شعبہ میں عرض کر رہا ہوں۔
ارشاد ہوتا ہے مسلمانوں سے خطاب کر کے "یہ کہو تم مذاہب عالم سے
کہ ہم تو ایمان لائے ہیں خدا پر اور اُس پر جو ہماری جانب نازل ہوا۔
اور جو نازل ہوا تھا ابراہیمؑ پر اسمٰعیلؑ پر اور جو تعلیمات ملی تھیں اسحٰقؑ اور یعقوب اور
اسباط بنی اسرائیل اور موسیٰؑ و عیسیٰؑ کو۔ اور جو دیگر نبیوں کو ملے تھے
اُن کے رب کی طرف سے سب کا ہم اقرار رکھتے ہیں۔
ہم اُن میں تفریق نہیں ڈالتے کہ کسی پر ایمان لائیں اور کسی پر ایمان نہ لائیں
اور ہم اُسکے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ (تو اب تم بھی سب چیزوں پر
ایمان لے آؤ جس کے ہم مومن ہیں)

فان آمنوا بمثل ما آمنتم بہ فقد اھتدوا وان تولوا فانما ھم
فی شقاق فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم۔
اگر یہ بھی ایمان لے آئیں اُنہی چیزوں پر جن پر تم ایمان لائے ہو تو صحیح

تو یہ ہدایت پا گئے ۔ اور اگر انھوں نے روگردانی کی تو یاد رکھو پھوٹ ڈالنے والے یہی ہیں (شقاق کے معنی ہیں شق ہو جانے کے یعنی معنی ہوئے پھوٹ ڈالنا) تو تمھیں کوئی پروا نہیں خدا تمھارا مددگار ہے ۔ اور وہ تمھاری آواز کا سننے والا ہے ۔ تمھارے حالات سے باخبر ہے ۔ جزو فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم مسلمانوں کے قوت انتقام کو روکنا ہے یعنی اگر انھوں نے روگردانی کی ۔ تو یہی پھوٹ ڈالنے والے ہیں مگر اب تم تلواریں لیکر اُن پر جا پڑو یہ نہیں بلکہ خدا کے حوالہ کرو ۔ ذمہ داری تو اُن پر عائد ہے لیکن تم ؟ خبردار تم حد سے نہ بڑھنا ۔ خدا تمھارا والی ہے ۔ اس طرح یہ بتایا کہ افتراق اُدھر سے ہے ۔ اسکے بعد ارشاد ہوتا ہے ۔ امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون کل امن باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ لا نفرق بین احد من رسلہ ۔

ہمارا رسول خود اقرار کرتا ہے " ایمان لایا ہے اُن چیزوں پر جو اُسپر نازل ہوئیں ۔ خدا کی طرف سے ۔ اور وہ جو ایمان لائے ہوئے ہیں اُسکے ساتھ ۔ ہر ایک اُن میں سے ایمان لاتا ہے کتابوں پر ۔ ملائکہ پر رسولوں پر ۔ اور اُسکے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتا " ہم کسی کا انکار نہیں کرتے ۔ نزل علیک الکتاب بالحق مصدقاً لما

بین یدیہ اُس نے نازل کیا تمہارے اوپر کتاب کو حق کے ساتھ جو تسلیم کرنے والی ہے اسکو جو اُسکے پہلے تھا۔ کوئی تعیین نہیں کی توریت کی۔ انجیل کی۔ تاکہ دوسری کتابیں جو تھیں وہ خارج نہ ہو جائیں کیسی کو وہ جھٹلانے پر تیار نہیں۔ وانزل التوراۃ والانجیل من قبل ھدی للناس وانزل الفرقان۔ اُس نے نازل کیا توریت کو انجیل کو۔ انکے نام خصوصیت سے اسلئے لے لئے کہ جسوقت قرآن نازل ہوا ہے۔ جو لوگ براہ راست مخاطب تھے۔ وہ یہودی اور نصاریٰ ہی تھے۔ اسلئے عمومی دائرہ میں تو سب کو لے لیا۔ اور خصوصیت سے انجیل اور توریت کا نام لے لیا۔ اگر اُس زمانہ کے عربوں کے سامنے مثلاً نام لیا جاتا ہندوستان کی کتابوں کا۔ جن کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے تو کون سمجھتا۔ اسکو عموم میں رکھا۔ نام لینے کی ضرورت نہیں ہے امکان ہے اسمیں ہر ایک کے آجانے کا۔ آگے چل کر ارشاد ہوا کہ وہ بھی لوگوں کی ہدایت کیلئے نازل ہوئی تھیں۔ اُسی خدا نے قرآنمجید بھی نازل کیا ہے۔

قل امنا باللہ وما انزل علینا وما انزل علی ابراھیم و اسمٰعیل و اسحٰق و یعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ و عیسیٰ والنبیون من ربھم لا نفرق بین احد منھم

ونحن لہ مسلمون۔

شبہ ہوگا کہ یہ آیت وہی ہے جو پہلے ذکر ہو چکی۔ نہیں، یہ دوسری آیت ہے۔ اُسمیں "قولوا" تھا اسمیں "قل" ہے۔ وہاں تمام مسلمانوں سے کہلوایا گیا۔ یہاں صرف رسولؐ سے کہلوایا جارہا ہے۔ مگر بحیثیت نمائندہ تمام عالم اسلام "تم کہو اے رسولؐ! کہ ہم سب ایمان لائے ہیں اُس پر جو ہمارے اوپر نازل ہوا اور اُس پر جو نازل ہوا ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ وغیرہ پر۔

اس طرح سب کیلئے جگہ رکھی آیت نے عموم پیدا کر کے۔ اور کچھ کا نام لے دیا جگہ دی ہر مذہب والے کو یہ کہکر کہ والنبیون من ربھم تمام وہ نبی جو رب کی طرف سے تھے۔ اُن سب پر ہم ایمان لائے۔ کسی میں تفریق نہیں قرار دی" یا ایھا الذین اوتوا الکتاب امنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم۔ یہاں اہل کتاب سے خطاب کیا گیا ہے جن کو خداوند عالم سے کتاب عطا ہوئی۔ براہ راست یہود و نصاریٰ ہیں۔ لیکن عموم میں ہر وہ شخص داخل ہے جو کتاب خدا کا مدعی ہو۔ اس لئے کہ قرآن نے الفاظ عام کر دئے ہیں اے وہ کہ جو کتاب خدا کے ماننے والے ہو۔ اسکو بھی مان لو جس کو ہم نے اُتارا ہے۔ پھر جو اُتارا ہے یہ خلاف نہیں ہے اُسکی

جو تمہارے پاس تھا۔ یہ تو اُس کی تصدیق کرتا ہے۔

اسکے بعد ارشاد ہوتا ہے ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا اولئک ھم الکافرون حقا واعتدنا للکافرین عذابا مھینا۔

وہ لوگ کہ جو کفر اختیار کرتے ہیں۔ انکار کرتے ہیں۔ خدا کا اور اُسکے رسول کا اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ تفریق ڈالیں خدا اور آسکے پیغمبروں کے درمیان میں اور یہ کہتے ہیں کہ بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا کفر کرتے ہیں۔ (یہودی کہتے ہیں ہم موسیٰؑ پر ایمان لائے ہیں۔ مگر عیسیٰؑ پر ایمان نہیں لائے۔ نصاریٰ کہتے ہیں موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو مانتے ہیں مگر محمد مصطفےٰؐ پر ایمان نہیں لاتے) یہ چاہتے ہیں کہ ایک درمیانی راستہ اختیار کریں۔ یہ لوگ بیشک کافروں میں داخل ہونے کے لائق ہیں اور کافروں کے لئے عذاب دردناک ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے والذین امنوا باللہ ورسلہ ولم یفرقوا بین احد منھم اولئک سوف یوتیھم اجورھم وکان اللہ غفورا رحیما۔

جو ایمان لائے ہیں خدا اور آسکے تمام رسولوں پر اور اُن میں تفریق نہیں

کرتے ہیں وہ بے شک مغفرت کے مستحق ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ محاورہ اور اصطلاح کو جو اُس نے قرار دی ہے واضح کردوں۔

میں نے عرض کیا کہ بنائے مخاصمت جو پیدا ہوئی تھی اسلام اور دوسرے مذاہب میں وہ اسلام کی طرف سے نہیں۔ بلکہ دوسرے مذاہب کی طرف سے تھی۔ اسلام تو اُن سب کا اقرار کرتا ہے جس کو دوسرے منوانا چاہتے ہیں مگر وہ انکار کرتے ہیں۔ تو اب دیکھئے قرآن مجید نے اصطلاح کیا قرار دی۔ اپنے حلقہ بگوشوں کی لئے یہ کہا کہ تم "مسلم" ہو۔ کیا معنی یعنی سر تسلیم خم کرنے والے۔ یہ مسلمان ہوئے۔ جو اسکے خلاف ہے اسکے لئے "کافر" کا لفظ قرار دیا گیا ہے۔ کافر کے معنی؟ انکار کرنے والا۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ بس افتراق یہاں سے پیدا ہوا۔ اسلام اقرار کرتا ہے کسی کا انکار نہیں کرتا۔ اور دوسرے انکار کرتے ہیں۔ یہاں حدفاصل کھنچی ہے۔ کفر کے معنی چھپانے کے بھی ہیں۔ اس لفظ کو قرآن مجید نے یوں صرف کیا ہے کہ یہ لوگ جو تفریق کرتے ہیں۔ یہ حقدار ہیں اس کے کہ ان کو کافر کہا جائے۔ اسلئے کہ اُنھوں نے انکار اُس بات کا کیا جو ماننے کے قابل تھی جو اسلام کے ماننے والے ہوے وہ مسلم ہوے۔ جو یقین کرنے والے تھے وہ مومن ہوے یعنی یقین کرنے والے ایمان لانے والے ہیں۔ اسلام کا کام ہے۔ "ماننا" کفر کا کام ہے "نہ ماننا"

یہی تفریق دنیا میں قائم کی گئی ہے۔

اب اگر اسلام نے بھی کسی چیز سے انکار کیا ہوتا تو بے شک دوسرے لوگوں کو بھی یہ کہنے کا اختیار ہوتا کہ جس طرح ہم اقرار کرتے ہیں کسی چیز کا اور انکار کرتے ہیں۔ اسی طرح تو تم بھی کسی کا اقرار کرتے ہو۔ اور کسی کا انکار کرتے ہو۔ لہذا تم بھی کافر ضرور ہوے۔ مگر اسلام نے تو کسی کا انکار کیا ہی نہیں۔ تو پھر وہ الفاظ اب رہے۔ کیونکہ اسلام نے تو ایک معیار پیش کردیا۔ لغوی معنی کے تحت میں ایک لقب دیدیا۔ ہم اس لقب کی زد میں نہیں آتے۔ اور یہ جب ہوگا کہ جب اسلام انکار نہ کرے کسی ایسے فرد کا جو اسکے پہلے سے مانا جارہا ہو اسلام کی تعلیم صرف ماننا ہے۔ اسکے مقابلہ میں اغیار جو ہیں وہ نہ ماننے کے جرم کے مرتکب ہیں۔ یہ لوگ کافر ہیں۔ قرآن کوئی خاص محاورہ اور اصطلاح نہیں قرار دے رہا ہے۔ بلکہ لفظ کو معنی پر منطبق کرنا چاہتا ہے۔ لہذا یہ مستحق ہیں کہ ان کو کافر کہا جائے یہ استدلال ٹوٹ جاتا۔ اگر اسلام بھی کسی کا انکار کرتا۔

انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ واوحینا الی ابراھیم واسمعیل واسحق ویعقوب والاسباط وعیسی وایوب ویونس وھرون وسلیمن واتینا داؤد زبورا ورسلا قد قصصناھم علیک من قبل ورسلا لم نقصصھم علیک

وکلم اللہ موسی تکلیما۔

یہاں ایک حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ جسے میں چاہتا تھا کہ آئندہ بیان کروں۔ لیکن چونکہ وہ آ بحث آ گئی۔ اسلئے کہدینا ضروری ہے "انبیا" اور "مرسلین" وہ ہیں۔ جنھیں صریحی طور سے تسلیم کیا گیا ہو جیسے عیسیٰؑ۔ موسیٰؑ۔ ابراہیمؑ۔ ان کی نبوت کی قرآن مجید میں صریحی طور سے تفصیل موجود ہے۔ اور بہت سے وہ اشخاص ہیں جن کو بہت سے لوگ اپنا پیشوا مانتے ہیں اور بہت سے لوگ انکی نبوت کے مدعی ہیں۔ لیکن قرآن مجید میں انکی صریحی طور سے تفصیل نہیں ہے۔ جیسے زردشت اُنکے متعلق کتاب سماوی بھی کہا جاتا ہے کہ موجود ہے ایرانیوں کے پاس جو خدا کی طرف سے ایک کتاب مانی جاتی ہے "ژند" اصل کتاب "پاژند" اُسکی شرح۔ جو اُنکے نزدیک الہامی حیثیت رکھتی ہے۔ اُسپر شرح و حواشی تحریر کئے گئے ہیں۔ یا جیسے ہندوستان کے مختلف افراد کے مذاہب۔ جو اپنے پیشواؤں کو مانتے ہیں۔ اور اُن کے لئے ایک شریعت کے قائل ہیں۔ ظاہری نظر میں مسلمان یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ سب سچے تھے مگر ایسا بھی نہیں کہ زردشت کو غلط سمجھیں۔ اور نہ اُنکو جو دوسرے مذاہب کے پیشوا ہیں اُن کو کاذب سمجھیں۔ محض اسلئے کہ اسلام نے اُن کی تفصیل نہیں کی ہے اس سلسلہ میں یہ بھی ہوتا ہے کہ جب اُنکی عظمت

کے سامنے سر تسلیم خم نہیں ہے تو ایسے الفاظ بھی استعمال کر دئے جاتے ہیں جو ایک رہنمائے مذہب کی حیثیت کے خلاف ہیں۔ ایسے الفاظ استعمال کر دئے جاتے رہیں جو ایک جھوٹے شخص کیلئے استعمال ہوتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف جذبہ عناد پیدا ہوتا ہے لیکن اگر آیت پر غور کیجئے تو یہ اندازہ ہوگا کہ اسلام نے کچھ لوگوں کے نام لیکر تفصیل کی ہے اور کچھ لوگوں کے ناموں کی تفصیل نہیں کی۔

ہمارا یہ خیال ہے۔ خیال ہی نہیں بلکہ دلیل کے ذریعہ سے مضبوط حیثیت رکھتا ہے کہ جناب رسالتمآبؐ کے قبل جتنے انبیا و مرسلین تھے اُنکے دلائل نبوت ختم ہو چکے۔ موجودہ دور زمانہ میں کسی مذہب کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنے مذہب کی حقانیت کو منوا سکے۔ عیسائیوں کے پاس دلیل نہیں ہے۔ زردشتیوں کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اسلئے کہ اُن کی نبوت و رسالت کی بنیاد تھی جن دلائل پر وہ دلائل وقتی حیثیت رکھتے تھے۔ ہمارے لئے وہ سمعی روایت سے بڑھکر نہیں ہیں۔ وہ بھی صرف ایک مذہب کے حلقہ بگوشوں ہی میں جاری ہیں۔ وہ اُن لوگوں کے تسلیم کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں جو اُس مذہب کے نہ ہوں۔ ہر مذہب کا پیشوا جو بھی ہو اُس مذہب کے افراد میں اُس پیشوا کے متعلق بہت سی غیر معمولی باتیں ضرور مشہور

ہوا کرتی ہیں اس قسم کے دلائل درحقیقت بروقت دقوع۔ دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور بے شک جسوقت اُن دلائل سے کام لیا گیا تھا ہو قت وہ کامیاب بھی تھے۔ ایک دلیل کی کامیابی کا معیار اتنا ہے کہ اُس کو دیکھکر تسلیم نہ کرنے والا۔ بس ہٹ دھرم سمجھا جائے۔ اور ایک منصف مزاج اُسکا اقرار کرنے پر مجبور ہو تو یقیناً وہ دلیل عقلی حیثیت سے کامیاب ہے لیکن اب وہ دلائل بالکل موجود نہیں ہیں۔

اسلئے میں سچ کہتا ہوں کہ موسوی قاصر ہیں۔ موسیٰ کی نبوت ثابت کرنے سے عیسائی قاصر ہیں عیسیٰ کی نبوت ثابت کرنے سے۔ مسیح حقیقتاً خدا کے فرستادہ پیغمبر تھے مگر دنیائے عیسائیت اُس کے اثبات میں عاجز ہی ہے۔ ہمارے مقابلہ میں نہیں۔ یہودیوں کے مقابلہ میں دلائل نہ ملیں گے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت ثابت کر سکیں۔ اب وہ نشانیاں بھی رخصت ہو چکی ہیں جو اُسوقت موجود تھیں۔ اب اگر یہودی انکار کریں حضرت عیسیٰ سے تو عیسائیوں کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے لیکن مسلمانوں کے لئے اسلام زندہ مذہب ہے۔ اسلئے کہ اُسکے دلائل زندہ ہیں۔ اُسکے حجج و براہین زندہ ہیں۔ موسائی خاموش ہو جائیں موسیٰؑ کی نبوت ثابت کرنیکے مطالبہ پر۔ مسیحی خاموش ہو جائیں لیکن ایک مسلمان نہیں خاموش ہوگا۔ اسلئے کہ اسلام کی حقانیت

صرف معجزہ شق القمر پر نہیں تھی۔ جو ایک وقت میں ہو گیا معجزہ رد الشمس پر نہیں تھی کنکریوں کے تسبیح پڑھنے پر نہیں۔ وہ درخت کے کلام کرنے پر مبنی نہیں۔ اسلئے جس شخص نے نہیں دیکھا۔ وہ کہے کہ معلوم نہیں ہوا تھا۔ یا نہیں ہوا تھا۔ اسلام کی حقانیت تو مذہبی تعلیم پر مبنی ہے جس کا نام ہے "قرآن" اسلام اپنی حقانیت کے ثبوت میں معجزہ رد الشمس کو نہیں پیش کرتا۔ تاکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اسکو لیکر اعتراض کیا جائے نہ شق القمر کو پیش کرتا ہے۔

میں لکھ چکا ہوں تفسیر کے سلسلہ میں کہ درحقیقت معجزہ رد الشمس یا شق القمر تمام ایسی چیزیں تھیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں ہماری نظر میں اُس مرتبہ کی بلندی کو دیکھتے ہوئے جو رسول اور اہلبیت رسول کو حاصل تھی۔ وہ روزمرہ کی باتیں تھیں جو ہوا کرتی تھیں۔ وہ ایک کرامت تھی جو خدا کی طرف سے حاصل تھی۔ لیکن اسلام نے کبھی اُسکو حقانیت کے ثبوت میں پیش نہیں کیا۔ آپ تاریخ کے اوراق دیکھ ڈالئے کبھی رسولؐ نے کسی منکر اسلام کے سامنے یہ کہا ہو کہ میں سچا نبی ہوں۔ اسلئے کہ ایک دن میرے لئے قمر شق ہوا ہے۔ کبھی امیر المومنینؑ نے یہ کہا ہو کہ میں سچا امام ہوں۔ اس لئے کہ ایک مرتبہ آفتاب میرے لئے پلٹا تھا۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے

ہم کبھی اسلام کے ثبوت میں ایسی چیزوں کو پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ معجزہ ایک ویسا ہی معجزہ ہے۔ جیسے موسیٰ کے لئے عصا کا اژدہا بن جانا۔ جیسے درخت کا موسیٰ سے کلام کرنا۔ یا جیسے اُن کے ہاتھ کا روشن ہونا۔ ہم اسلام کے لئے یہ دلائل پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں ہمارے سامنے وہ معجزات ہزار حقیقتوں سے بڑھکر حقیقتیں رکھتے ہیں لیکن ہم اُن کو کوئی اسلام اور کفر کی بحث نہیں بنائینگے۔

ہم اگر آج رد شمس پر بحث کریں گے تو تاریخی واقعہ کی حیثیت سے کہ کہاں تک روایات سے ثابت ہوتا ہے۔ شق القمر پر بحث کریں گے تو تاریخی حیثیت سے بحث کریں گے۔ اسلام اور کفر کی دلیل بنا کر نہیں پیش کریں گے۔ اسلام کی دلیل ہے۔ "قرآن" اُس نے جس جس کو تسلیم کر لیا۔ وہ بجائے خود مردہ تھا زندہ ہو گیا۔ موسائیوں کے پاس دلیل نہیں موسیٰؑ کی حقانیت کی۔ مگر ہمارے پاس ہے۔ عیسائیوں کے پاس عیسیٰؑ کے سچے ہونے کی دلیل نہیں۔ مگر ہمارے پاس ہے۔ کسی پیغمبر کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ اسکے معنی ہیں کہ تمام دنیا کے مذاہب اگر اسلام اقرار نہ کرتا تو مشکوک ہی رہتے۔

اگر اسلام انکار کر دیتا تو کون اسکی زبان پکڑتا۔ مگر اس نے موسیٰؑ کا اقرار کر کے موسویت کو زندہ کر دیا عیسیٰؑ کا اقرار کر کے عیسویت کو زندہ

کر دیا کسی مذہب کے پاس دلائل نہیں تھے۔ اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم قطعی طور سے غلط کہدیں۔ ثابت نہ ہونا اور بات ہے اور جھوٹا ہونا اور بات ہے شب کو ہمارے یہاں چوری ہو گئی۔ اور ہمارا دس وپیہ کا نوٹ کسی نے نکال لیا۔ اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ اسکو جھوٹا کہہ سکیں اگر وہ شہادت پیش نہ کر سکے۔ ثبوت کا ہونا اور چیز ہے۔ غلط ہونا اور چیز ہے اگر قرآن میں موسیٰ کا تذکرہ نہ ہوتا تب بھی ہم موسیٰ کو جھوٹا ماننے کا حق نہیں رکھتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ یقینی طور سے سچا سمجھنے کی کوئی وجہ نہ ہوتی۔ تمام انبیا کے لئے یہ ہے کہ چاہے ثابت نہ ہو چاہے ہم ایمان نہ لائیں لیکن انکار بھی نہ کریں۔ زردشت اور دوسرے پیشوا جن کو مختلف مذاہب مانتے ہیں قرآن نے موقع ضرور دیا ہے اُن کی سچائی کا۔ اگر قرآن یہ کہدیتا کہ جن کے نام ہم نے بتا دیے بس اُتنے ہی ہیں۔ اور کوئی نہیں ہے۔ تب تو ہم یقینی طور سے اُن کو غلط کو کہنے کا حق رکھتے۔ لیکن قرآن انھی پر حصر نہیں کرتا۔ تو اب آپ کو کسی کے دعوے کو غلط کہنے کا حق نہیں ہے۔ قرآن تو صراحتاً یہ ارشاد کرتا ہے کہ ورسلا لم نقصصھم علیک۔

بہر حال ارشاد یہ ہوتا ہے کہ "کچھ انبیا کا تذکرہ نہیں ہوا" ہم نے جو وحی کی ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے وہ اُسی طرح کی ہے جیسے نوح پر ابراہیمؑ

اسمٰعیل پر۔ اسحٰق پر یعقوب پر اسباط بنی اسرائیل پر عیسیٰ پر ایوب پر یونس پر
ہرون پر سلیمان پر اسکے پہلے ہوئی اور داؤد کو ہم نے زبور عطا کی۔ اور
بہت سے رسول ایسے تھے جن کا ہم نے اس سے پہلے تذکرہ کیا ہے۔ اور
بہت سے ایسے بھی تھے جن کا ہم نے ذکر نہیں کیا"۔ تو معلوم ہوا کہ جن کے
نام لئے گئے ہیں قرآن مجید میں اور ان کے علاوہ بھی کچھ تھے۔ ایسے
افراد جن کے نام نہیں لئے گئے۔ لیکن اسکے ساتھ ساتھ یہ بھی ہمیں
معلوم ہے کہ بہت سے غلط گو دعویٰ کرنے والے بھی گذرے ہیں۔
جن کی خبر برابر توریت میں دی گئی ہے۔ ہیں ایسے اور آئندہ بھی ہونگے
رسولؐ کے زمانہ میں بھی ہوئے ہیں۔ مسیلمہ کذّاب۔ ترقی کرنے لگا تھا
زمانہ رسولؐ میں۔ ایک عورت نے بھی دعویٰ کر دیا تھا، ترقی کا ہی معیار
ہے نہ؟ نبی ہے تو نبیّہ بھی ہو۔ استدلال بھی یہ کیا گیا تھا کہ حدیث
تو یہ ہے کہ "میرے بعد کوئی نبیؐ نہ ہوگا" مگر یہ تو کہا نہیں تھا کہ
نبیّہ بھی نہیں ہوگی۔ ایسے لوگ ہر زمانہ میں ہوا کئے ہیں تو اسی
وجہ سے آشیانہ نبوت دو عملہ میں پڑ گیا۔ یعنی آیت یہ کہہ رہی ہے
کہ بہت سے رسول ایسے ہیں جن کے نام نہیں ذکر کئے گئے۔ اس میں
زردشت بھی آ سکتے ہیں۔ اسمیں اور دوسرے پیشوایان مذہب بھی
آ سکتے ہیں لیکن اسکے ساتھ چونکہ نام نہیں لکھے ہوئے ہیں

اور یہ معلوم ہے کہ غلط گو بھی کچھ ہوئے ہیں دنیا میں۔ تو ہر ایک آ بھی سکتا ہے۔ اور نہیں بھی آ سکتا۔ اسلئے بحیثیت مسلمان ہونیکے ایمان لانے کی کوئی وجہ نہیں پاتے زردشت پر، کرشن جی پر۔ دوسرے اوتاروں پر۔ لیکن یہ بھی حق نہیں ہے کہ ہم برا کہیں۔ ہم کلمات ذلت آمیز استعمال کریں۔ لیکن اگر کسی شخص کے لئے کسی وجہ سے تاریخی بنا پر درحقیقت ثبوت حاصل ہو جائے زردشت کی نبوت۔ یا کسی دوسرے پیشوائے مذہب کی رسالت کا تو اسلام منع بھی نہیں کرتا۔ اسلئے کہ اسلام نے کہدیا کہ بہت سے ایسے رسول ہیں جن کا قصہ ہم نے تم سے نہیں بیان کیا۔ ہو سکتا ہے کہ زردشت بھی انہی میں سے ہوں۔ لیکن ایک اختلافی چیز ہے اور ہماری نظر میں وہ قرائن تاریخی کمزور ہیں تو ہم تسلیم نہ کریں گے۔

مانتے ہو اگر زردشت کو۔ تسلیم کر لو۔ نبی۔ جیسے حضرت موسیٰ کو مانتے ہو۔ ویسے ہی مان لو۔ موسیٰ کی شریعت کو اسلام نے تنسیخ کر دیا۔ ویسی ہی زردشت کی شریعت بھی سہی۔

مگر۔ وہ تعلیم وقانون اب واجب العمل ہو؟ ایسا نہیں ہے۔ وہ فسانۂ ماضی ہو گیا۔ مان لیجیے۔ مگر وہ عملی چیز نہیں رہی۔ فرض کیجیے کل آپ نے اپنے ملازم سے کسی کام کو کہا۔ بہت بلند آواز سے کہا تھا۔ وہ سو رہا تھا

جب اُس نے دوسرے دن آنکھ کھولی اُسے معلوم ہوا۔ جان تو لیا۔ مگر اب جان کے کیا کرے؟ کچھ نہیں۔ اس لئے کہ وقت اُس عمل کا گذر گیا۔ ویسا ہی یہ ہے۔ زردشت نبی تھے یا نہیں؟ اچھا تھے نبی۔

قرآن مجید نے تمام انبیا کے حقانیت اور سچائی کے لئے حق رکھا ہے اسلئے ایک مسلمان زردشت کی نبوت کا قائل ہو اُسی حد میں جتنا اسلام نے بیان کیا ہے۔ تو زردشت کی کتاب بھی سہی۔ یہ وید بھی سہی۔ تو قابل اعتراض ہمارے لئے نہیں ہے۔ مسلمانوں کو یہیں سے ایک سبق ملتا ہے کہ کسی دوسرے مذہب کے پیشواؤں کے خلاف تم بے ادبی سے اعتراض نہ کرو۔ بلکہ خاموش رہو۔ یا ایسے الفاظ کہو کہ تعریف بھی کر دو۔ مگر تعریف سچ ہو اگر تم اسکی کسی عظمت کے قائل ہو جاؤ تو ہمیں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر یہ دل نشیں ہو جائے تو بہت سے عناد و مخاصمت کے دروازے بند ہو جائیں جو کھلے ہوئے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے۔ یہودیوں کے مقابلہ میں عندھم التوریٰۃ فیھا کلام اللہ ثم یتولون من بعد ذلک اُنکے پاس توریت موجود ہے۔ مگر عمل نہیں کرتے "

اسکے علاوہ یہ ارشاد ہوتا ہے ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون۔ جو لوگ خدا کی اتاری ہوئی بات کیا تھ

فیصلہ نہیں کرتے یہ انکار کرنے والے کافر ہیں"۔

یہاں سے بھی درحقیقت اسلام کی ایک اور رواداری کا پتہ چلتا ہے آپ ذرا حقیقت امر پر غور کیجئے۔ واقعہ کی نوعیت پر۔ ایک اقرار کرنے والا۔ ایک انکار کرنے والا۔ وہاں۔ اسلام نے جو سخت سے سخت الفاظ استعمال کئے ہیں وہ "انکار کرنے والا" یعنی "کافر" درحقیقت اگر آپ ان سے پوچھتے تو وہ خود کہتے کہ ہم ضرور کافر ہیں ہم تسلیم نہیں کرتے۔

اسلام پر یہ اعتراض نہ کیجئے کہ لاتنابزو بالالقاب "برے لقب سے نہ یاد کرو" وہ کافر کے مقابلہ میں اسیر عامل ہے۔ کہ کوئی برا معلوم ہونے والا لفظ نہیں استعمال کیا۔ بلکہ جو واقعہ تھا "انکار کرنیوالا" وہ لفظ دے دیا۔ تو معلوم ہوا کہ اسلام نے درحقیقت دوسرے مذہب کے مقابلہ میں ایک حد فاصل قرار دی ہے۔ کہ ہم کسی مذہب کا اس کے اصل اور بنیاد کے اعتبار سے انکار نہیں کرتے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ تمہارا مذہب ایک صحیح اصول پر مبنی ہے۔ ایک صحیح بنیاد پر قائم ہے۔ یہ عام افراد کی کارستانی ہے کہ غلط فہمیاں شریک کر دی ہیں۔ ہر مذہب بحیثیت روح وجوہر کے حق ہے۔ روح تمام مذاہب کی ایک ہے، اسلئے یہ ارشاد ہوا کہ اسلام کو کوئی نیا

مذہب نہ سمجھو اصل دین تو کبھی بدلتا ہی نہیں۔ اصل تو سب کی ایک ہی ہے موسائیت درحقیقت اسلام ہے عیسائیت حقیقتاً اسلام ہے زردشتیت درحقیقت اسلام ہے۔ فروع اور چیز ہیں ان کا نام ہوتا ہے شریعت لیکن دین نام ہوتا ہے۔ اصول کا۔ دین ایک ہی ہوتا ہے۔ دین میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

لاتبديل لسنة الله "خدا کے مقرر کئے ہوئے راستے میں تبدیلی نہیں ہوتی"۔ ان الدين عند الله الاسلام دین تو بس خدا کے یہاں ایک ہی ہے جس کا نام ہے اسلام"۔ اسکے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ آدمؑ آئے انھوں نے کیا کہا؟ مجھے تسلیم کرو۔ جو مانے وہ "مسلم" جو نہ مانے وہ کافر۔ نوحؑ آئے کہا مجھے تسلیم کرو جس نے مانا وہ مسلم جس نے نہ مانا وہ کافر۔ ابراہیمؑ آئے کہا مجھے تسلیم کرو۔ جس نے مانا وہ مسلم۔ جس نے نہ مانا وہ کافر۔ موسیٰ آئے کہا مجھکو مانو جس نے مانا وہ مسلم۔ جس نے نہ مانا وہ کافر۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ دین میں ہمیشہ بس مسلم اور کافر ہی کی تفریق رہتی ہے۔ دین حق کے ماننے والے ہمیشہ مسلم رہے ہیں۔ الگ جانے والے ہمیشہ کافر رہے۔

اسلئے یہ ارشاد ہوا کہ درحقیقت یہ تمام مذہب ایک ہی ہیں نام کی تبدیلیاں بعد کو پیدا ہو گئی ہیں۔ مفہوم "مسلم" پہلے سے تھا۔ لقب

ابراہیمؑ نے دیا ھو سماکم المسلمین یہ نہیں کہا کہ تمھیں مسلم بنایا اُنھوں نے، مسلم ہمیشہ سے تھا۔ بطور نام بحیثیت لقب کے ابراہیم نے تمھارا نام مسلم قرار دیا۔ وجہ تسمیہ پہلے سے موجود تھی۔

اسکے بعد یہ اعلان کیا کہ ولکل اُمۃ رسول" دنیا میں کوئی ملک اور کوئی اُمت نہیں۔ ایسی جس میں ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا ہے" ہر امت کیلئے ایک رسولؐ ہے"

میرا کلام اُن افراد کے متعلق تھا۔ اُن پیشوایان مذہب کے متعلق تھا جنکی طرف مختلف مذہب نسبت رکھتے ہیں جیسے یہودیوں کو حضرت موسیٰؑ سے نسبت ہے یا عیسائیوں کو حضرت مسیح سے یا پارسیوں کو زردشت سے۔ اور ہندوؤں کے مختلف مذاہب کو اپنے اپنے پیشیردوں کی طرف نسبت ہے اصل نقطہ بحث وہی تھا۔ اُسکے متعلق کلام کیا گیا۔ اور میں نے یہ کہا کہ وہ افراد جو محتمل النبوۃ ہیں یعنی جن کی نبوت دائرۂ ثبوت میں نہیں آئی ہے لیکن قطعی طور سے کوئی دلیل اُنکے بطلان پر بھی قائم نہیں ہوئی ہے۔ اُن کی نسبت ہمیں حق نہیں ہے کہ ہم اُنھیں کسی حیثیت سے برا کہیں۔ اسلئے کہ جب شبہ ہے اسکا کہ نبی ہوں اور نبی ہونے کی حیثیت سے معصوم بھی ہونگے تو ہمیں کیا حق ہے کہ کسی ایسے لفظ کا

ؐ یہ اُن شکوک کا دفعیہ ہے جو گذشتہ بیان کی نسبت بعض اشخاص کو پیدا ہوئے تھے۔

استعمال کریں اُنکی نسبت جو بر فرض نبوت اُن کی شان کے خلاف ہو۔ اسلئے ہمارے لئے یہ روا نہیں ہے کہ اُن کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کریں۔ کیونکہ یہ وہ افراد ہیں جن کے متعلق عصمت کا احتمال ہے۔ اگر کسی کا قطعی طور سے کذب ثابت ہو جائے تو بیشک ایسا الفاظ استعمال کر سکتے ہیں جس کا ایک کاذب مستحق ہو سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک نفی و اثبات دونوں کے ادلہ مساوی ہوں۔ وہاں جس طرح ہمیں اُنکی نبوت کے تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اسی طرح اُن کے خلاف زبان کشائی کا بھی کوئی حق نہیں رکھتے۔

یہ بحث جو میں نے پیش کی اسکا تعلق کسی اسلامی مختلف فیہ مسئلہ سے نہیں ہے کہ اُسکے متعلق کوئی نتیجہ نکالا جا سکے۔ ؟ یہ تو اسلام اور غیر اسلام کی بحث ہے اسمیں کسی اسلامی اختلافی بحث پر کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا۔ اور نہ اس سے کوئی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ جو اسلام سے تعلق رکھتا ہو۔

اسی طرح سے اور بہت سے توہمات ایسے ہیں جو در حقیقت ظاہر کلام پر غور کرنے سے دور ہو سکتے ہیں۔ مستقل طور سے اُنکا بیان یہاں مناسب نہیں ہے۔

میں نے یہ عرض کیا کہ اسلام نے تمام مذاہب کے مقابلہ میں جو رویہ

اختیار کیا۔ اُس رویہ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت اسلام نے بناء مخاصمت نہیں قائم کی۔ بلکہ بناء مخاصمت فریق مقابل کی طرف سے قائم ہے۔ اسلام نے دنیا کے کسی مذہب کو باعتبار اُسکے اصل و بنیاد کے غلط نہیں کہا۔ اسلام نے کسی مذہب کے دعوائے روحانیت کو جسکے متعلق وہ اپنے کو منسوب کرتا ہے۔ رد نہیں کیا۔ کاذب نہیں کہا۔ بلکہ ہم نے شواہد پیش کئے۔ جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے کچھ لوگوں کا نام لیکر تفصیل کر دی۔ کچھ لوگوں کے نام نہیں لئے بلکہ بطور اجمال خبر دے دی کہ انکے علاوہ جن کا ہم نے "تذکرہ کیا ہے" اور بھی افراد ہیں جن کو ہم نے دنیا کی ہدایت کیلئے بھیجا"۔
"بہت سے رسول ایسے ہیں جن کا ہم نے تم سے ذکر کیا۔ اور بہت سے ایسے ہیں جن کا ہم نے تم سے ذکر نہیں کیا" تو ہم کو کیا معلوم کہ وہ کون کون تھے جن کا ذکر نہیں کیا گیا جو ہستی ہمارے سامنے پیش ہو جس کے متعلق قابل احترام نسبت دیجاے۔ اُسکے متعلق ہمیں شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی اُنہی افراد میں ہو جن کی تفصیل نہیں کیگئی۔

اسلئے کہ یہ مشہور بات ہے اگرچہ قرآن مجید میں نہ ہو۔ لیکن زبان زد عام ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مبعوث کئے گئے۔ قرآن مجید اور حدیث کی جستجو سے یہ مردم شماری پوری نہیں ہوتی حدیث سے بھی

جن کے اسماء ثابت ہوتے ہیں وہ بہت کم تعداد ہے ۔

آپ چھوٹی چھوٹی کتابوں میں بچوں تک کو عقیدہ نبوت کی تعلیم میں یہ یاد کراتے ہیں کہ خدا نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مبعوث کیے خبیں پیغمبر آخرالزماں ہمارے پیغمبر ہیں ۔

اب ہمیں کیا معلوم کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار جو تھے اُن میں زردشت نہیں تھے یا اور کوئی پیشوائے مذہب جس کے متعلق نبوت کا ادعا کیا جاتا ہے وہ نہیں تھا ۔ لہذا جبتک دلائل نفی کے قائم نہ ہوں اسوقت تک نہیں کہہ سکتے کہ غلط ہے ۔ قرآن مجید نے تمام مذاہب عالم کے سامنے آکر کسی کو غلط نہیں کہا ۔ باعتبار اُسکے اصل و بنیاد کے بلکہ یہ کہا کہ ہم تسلیم کرتے ہیں اپنے تمام پیشروؤں کو جو ہماری ہدایت سے پیشتر آچکے ہیں ۔ اُن سب کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اس نبی پر بھی ایمان لاؤ جس کی شریعت تمھارے سامنے پیش کی جارہی ہے ۔

اسلام نے کسی کے خلاف کوئی بات نہیں کہی ۔ بیشک اُن تمام کو تسلیم کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا گیا کہ چونکہ ہم ایمان لاتے ہیں ان سب پر جنھیں تم مانتے ہو لہذا تم میرے اوپر ایمان لاؤ ۔ لیکن انکار اُدھر سے ہوا ۔ اور اُنھوں نے تسلیم نہیں کیا ۔ اگر دلائل نہ ہونے کے باعث تسلیم نہ ہوتا تو حق بجانب تھا ۔ اگر مطلوبہ دلائل کے بنیاد پر تسلیم نہ ہونا

تو صحیح تھا لیکن باوجود برہان کے پھر بھی قابل تسلیم بات کو تسلیم نہ کیا یہانتک کہ ایمان اور کفر کی تفریق قائم ہوئی یعنی "ماننے والے" اور "نہ ماننے والے" اسلام نے کسی مذہب کے خلاف اسکے اصل و بنیاد پر کوئی المباخط انکار نہیں کھینچا کہ دنیا کو اسلام کے مقابلہ میں صف آرائی کی ضرورت ہوتی۔ بلکہ اُس نے کہا کہ اسلام تو درحقیقت وہ چیز ہے جسکو تمام انبیا اور مرسلین لائے تھے۔ اسلام کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اسلام ہر زمانہ میں اسلام تھا۔ اور ہر زمانہ میں اسکے مقابل کفر تھا مفہوم اسلام اور کفر کا نہیں بدلا۔ مفہوم ایک ہی ہے۔ جیسے (میں اسکی مثال بھی آپکے سامنے پیش کروں) ایک شخص نے اپنے تمام دوستوں سے یہ خواہش کی ہے کہ تم ہماری اولاد کو نظر عزت سے دیکھنا۔ اتفاق سے جسوقت اُس نے یہ خواہش پیش کی تھی۔ اُسوقت اُسکے ایک ہی فرزند تھا دائرہ کلام کا مفہوم اُس کا یہی تھا کہ اُسکی اولاد کو اسکے بعد عزت کی نظر سے دیکھا جائے۔ مگر اُسوقت ایک ہی فرزند تھا۔ سال بھر کے بعد اُسکے یہاں ایک اور فرزند ہوا اور وہ بڑھا۔ تو حکم وہی ایک مفہوم نہیں بدلتا۔ اسکے بعد مردم شماری اور طبعی نسل میں ترقی ہوئی۔ افراد میں کثرت پیدا ہوئی۔ جتنی چاہے اولاد میں کثرت ہوجائے۔ مفہوم نہیں بدلتا لیکن مصداق میں تغیر پیدا ہوتا ہے اگر کسی نے ایک کی مخالفت کی۔ تو اُس حکم سے عدول ہوگا۔ لیکن اُسوقت میں

وہ ایک ہی تھا۔ اور اب اُنکی تعداد سیکڑوں تک پہونچ گئی۔ تو کیا معنی بدل گئے؟ معنی تو وہی ایک رہے لیکن وسعت میں اس معنی کی تفریق ہوتی گئی۔ ویسے ہی "اسلام" کیا؟ تسلیم کرنا خدا کے پیغام کا "کفر" کیا؟ نہ ماننا جسوقت آدم مبعوث ہوئے۔ ایک نبی دنیا میں آیا تھا اسلئے اسلام کیا؟ اُسکا ماننا۔ کفر؟ اُسکا نہ ماننا۔ نوحؑ آئے۔ اب اسلام کیا ہے معنی میں اسلام کے کوئی تفریق نہیں ہے۔ اب بھی وہی ہے "خدا کے پیغام کا ماننا" اب بھی وہی "خدا کے فرستادہ کا تسلیم کرنا" لیکن فرستادہ پہلے فقط آدمؑ ہی کی ذات تھی۔ اب نوحؑ کا اضافہ ہو گیا۔ لہذا جو نوحؑ کو نہ مانے۔ اُسنے پیغام الٰہی کو تسلیم نہیں کیا۔ کل تک فقط آدمؑ کا ماننے والا مسلم تھا۔ آج وہی فقط آدم کا ماننے والا کافر اسکے بعد "نبوت" پہونچی حضرت ابراہیمؑ تک۔ مفہوم اسلام کا کیا؟ پیغمبر کو تسلیم کرے۔ وہی مفہوم اسلام کا لیکن کل تک صرف آدمؑ و نوحؑ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والا مسلم تھا۔ اسکے علاوہ اور کوئی ضرورت نہ تھی اسلئے کہ دو ہی تو تھے۔ اب جسوقت ابراہیم مبعوث ہوئے۔ تو اب بھی مفہوم "اسلام" و "کفر" کا وہی تھا۔ مگر اب؟ آج فقط آدمؑ و نوحؑ کا ماننا کفر ہے کل تک وہ مسلم ہے۔ آج وہ کافر ہے۔ اسکے بعد موسیٰؑ آئے اسلام کچھ بدل گیا؟ نہیں! وہی رہا یعنی تسلیم کرنا ہمارے پیغام کا۔ ہماری طرف سے

آئے ہوئے رہنماؤں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا۔ مگر وہی تفریق ہو گئی۔ کل تک آدمؑ۔ نوحؑ۔ ابراہیمؑ کا ماننے والا مسلم تھا آج جب موسیٰ آئے۔ تو صرف ان کو نہ ماننا۔ اور سب کو ماننا۔ کفر ہے۔

اسکے بعد سلسلہ اور بڑھا عیسیٰؑ آئے۔ اسلام وہی رہا لیکن نتیجہ مختلف ہو گیا۔ اب موسیٰؑ پر ایمان لانے والا کل تک مسلمان تھا۔ آج موسیٰ پر ایمان لانے والا اور مسیح پر ایمان نہ لانے والا کافر ہے۔

اب عیسیٰؑ کے بعد خطِ نبوت کھنچا نقطۂ خاتمیت تک پہونچا۔ جناب رسولؐ مبعوث ہوئے۔ کیا اسلام اب کوئی نیا اسلام ہو گیا؟ ن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا وہی خدا کی فطرت وہی خدا کی پہلی بات۔ خدا کا طریقہ۔ راستہ اب بھی نہیں بدلا۔ اسلام بھی وہی ہے کفر بھی وہی ہے لیکن نتیجہ مختلف ہو گیا۔ کل تک عیسیٰؑ کو مان کر خاموش ہو جانے والا مسلم تھا۔ آج عیسیٰؑ کو مانکر کسی ایک ہستی کو نہ ماننے والا کافر ہے۔

اسلام کا مفہوم ہرگز نہیں بدلا لیکن جتنا دائرہ آگے بڑھتا جاتا ہے اتنی دائرہ میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں نے یہودی کو بھی مسلم بنا دیا۔ میں نے عیسائیوں کو بھی مسلم بنا دیا۔ میں اصل کے اعتبار سے سب کو مسلم کہہ رہا ہوں۔ ہر ایک اپنے نقطۂ ابتدا کے اعتبار سے مسلم تھا۔ ماننے کے بعد۔ اور نہ ماننے کے بعد کافر تھا۔ اسلام اور کفر کی

تفریق جو قائم ہوئی وہ ماننے اور نہ ماننے کی وجہ سے۔ اسلام نے دنیا میں کوئی بات ایسی نہیں قائم کی جو سبب افتراق ہو۔ لا نفرق بین احد من رسلہ ہم کسی میں تفریق نہیں کرتے۔ ہم سب کو مانتے ہیں لیکن انکار جہاں سے شروع ہوا وہاں سے افتراق پڑا۔ وان تولوا فانما ھم فی شقاق اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو درحقیقت افتراق ڈالنے والے یہ ہیں۔ یہ سب سے پہلا روادارانہ طرز عمل تھا جو اسلام نے تمام مذاہب عالم کے مقابلہ میں اختیار کیا۔ اسکے بعد بھی یہ دیکھیے کہ جب دنیا نے انکار کیا تو انکار کے بعد تفریق کی بنیاد قائم ہوئی۔ اور اسلام اور دوسرے مذاہب جداگانہ حیثیت سے دنیا میں قائم ہوے۔ تو اب اسلام نے مسلمانوں کو کیا ہدایت کی؟ کیا یہ ہدایت کی کہ بس۔ اب تمھاری تلواریں ان کے قلع قمع میں مصروف ہو جائیں؟ بس اب انکی جماعت کو منفرق کر دو۔ بس اب انکے وجود سے صفحۂ ارض کو پاک و صاف کر دو۔ کیا یہی حکم تھا مسلمانوں کو؟

میں نے کل پیش کیا کہ "اگر یہ انکار کریں تو درحقیقت غلطی ہے اُنکی ذمہ داری افتراق کی اُنکے اوپر ہے مگر" فسیکفیکھم اللّٰہ وھو السمیع العلیم خدا تمھارا مددگار رہے خدا پر بھروسا کرو۔ وہ سننے والا ہے وہ جاننے والا ہے۔"

اُسکے بعد مختلف انداز سے مسلمانوں کو تشدد سے روکا۔ حد سے بڑھنے سے باز رکھا۔ رسالتمآب کو مخاطب کرکے (حالانکہ دوسروں کو سنانا منظور تھا) ارشاد ہوا۔

افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین۔ کیا تم لوگوں پر جبر کروگے یہانتک کہ وہ ایمان لائیں؟

کبھی یہ ارشاد کیا وما انت علیھم بمصیطر تمھیں ان پر جبر کی طاقت نہیں دی گئی ما علی الرسول الا البلاغ " ہمارے رسولؐ پر جو کچھ وہ تبلیغ کردینا ہے۔ اسکے سوا اور کچھ نہیں ہے " اب رسولؐ کو یہ تعلیم دی کہ تم یہ کہو " وما علینا الا البلاغ " اس سے زیادہ تمھارے اوپر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا۔ درحقیقت ہمارا کام جو کچھ بھی ہے وہ کلمۂ حق کی آواز کو پہونچا دینا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی فرض نہیں ہے۔ نہ ہمیں اس سے زیادہ کوئی قدرت حاصل ہے۔

اسکے بعد جسوقت آپ قرآن مجید میں آیات کو دیکھئے جس میں کفار ومشرکین کو مخاطب کیا گیا ہے۔ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کیسا رواداریانہ پہلو کارفرما ہے۔ ان آیات میں جن میں خطاب کیا گیا ہے مختلف مذاہب کو دنیا کے۔ ارشاد ہوتا ہے قل اتحاجوننا فی اللہ وھو ربنا وربکم آپ توریت کا مطالعہ کرجائیے۔ انجیل کا مطالعہ کرجائیے۔ آپ دنیا کی

دوسری کتابوں کا مطالعہ کر جائیے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ توریت میں خدا کو
بنی اسرائیل کا خدا کہا جاتا ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ خدائی میں بھی تفریق
ہے۔ وہ دوسروں کا خدا نہیں ہے انھوں نے خدا کو اپنا کر لیا ہے۔ اسرائیل
کا خدا کہتے ہیں۔ انجیل میں بھی اسکی اولاد میں اپنے ہی کو بتایا گیا ہے۔ کہا
گیا ہے ہمارا وہ باپ ہے۔ اور ہم اسکی اولاد ہیں۔ ہمارے سوا اسکے کوئی
اولاد نہیں ہے۔

درحقیقت خدا کی خدائی کو صرف اپنے سے مخصوص کر لیا۔ قرآن مجید نے
اُن کے خیال کو بھی لکھا ہے نحن ابناء اللہ واحباؤہ قل فلم
یعذبکم بذنوبکم وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں (کہو
تو پھر خدا تم پر عذاب کیوں کرنے لگا"!

اسی طرح اُن لوگوں کا زعم یہ تھا کہ خدا کے ساتھ جو رشتہ ہم کو
حاصل ہے۔ وہ کسی کو حاصل نہیں ہے۔ خدا تو ہمارا ہی خدا ہے۔ دوسروں کا
نہیں ہے۔ تقاضا تو جواب کا یہی تھا کہ جب یہود کہتے کہ خدا ہمارا۔
نصاریٰ کہتے کہ خدا ہمارا۔ تو اسلام بھی کہتا کہ خدا ہمارا۔ اور کسی کا
نہیں۔ جیسی کہ افتاد طبع دنیا میں رائج تھی۔ اسلام بھی یہی کہتا کہ
"رب المسلمین"۔ لیکن اسلام کی رواداری ایسے تنگ خیال
کی مؤید نہیں تھی۔ اسلام نے ایک طرف یہ اعلان کیا جو ربوبیت کا

ظاہری مقصود ہے۔ کہ وہ "رب العالمین" ہے۔ "رب العالمین" کیا؟ جتنے عالم ہیں وہ سب کا رب ہے، نہ ہمارا ہے۔ نہ تمھارا ہے۔ وہ تو سب کا ہے۔ سب کے ساتھ اُسکو ایک نسبت حاصل ہے۔ تشریح کے ساتھ اپنی رواداری کو ظاہر کر دیا۔ اتحاجوننا فی اللہ ھو ربنا وربکم تم خدا کے بارے میں۔ ہم سے جھگڑا کرتے ہو؟ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے۔ اُسکا ہمارے اور تمھارے ساتھ یکساں تعلق ہے یکساں ربط ہے لنا اعمالنا ولکم اعمالکم" ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں۔ تمھارے لئے تمھارے اعمال ہیں"۔ اسمیں مخاصمت کیسی؟ بہر حال ہم کو بھی اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا ہے۔ اور تم کو بھی اپنی ذمہ داری پوری کرنی ہے۔ ہمارے اعمال کی بھی جواب دہی خدا کے یہاں ہے۔ تمھارے عمل کی بھی جواب دہی خدا کے یہاں ہے ونحن لہ مخلصون" اور ہم اُسکے لئے خالص عبادت بجالانے والے ہیں" اسکے بعد ان لوگوں کی یہ آرزوئیں تمنّائیں تھیں کہ جب ہم ہی خدا کے ساتھ رشتۂ محبت رکھتے ہیں۔ تابعداری کرتے ہیں تو بس نجات بھی ہماری ہی ہے وقالوا لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا او نصاری تلک اما نیھم قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔ "یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہ داخل ہوگا جنت میں

گروہ کہ جو یہودی ہو یا نصرانی ہو۔ ارشاد ہوتا ہے یہ اُن کی آرزوئیں ہیں اُن کی اُمیدیں ہیں جن کے بلغ نظروں کے سامنے لہلہارہے ہیں "اُن سے کہو کہ ہم تو دلیل کے پابند ہیں"۔ فقط زبانی دعووں سے کام نہیں چلتا ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ تم غلط کہتے ہو لیکن ثبوت تم کو پیش کرنا چاہیئے۔ دلیل پیش کرنا تمھارے ذمہ ہے۔ "دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو"

اسلام اُنکے مقابلہ میں اگر تمام دنیا کے سامنے کہنے کا حق رکھتا تھا کہ نہیں داخل ہوگا جنت میں مگر وہ کہ جو مسلم ہو اسلئے کہ کافر جنت میں نہیں جا سکتا۔ اگر کہتا بھی تو سچ کہتا۔ مگر اپنے مخاطبہ میں انداز رواداری کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام نے یہ نہیں کہا کہ تم غلط کہتے ہو۔ درحقیقت مسلم ہی بحیثیت مذہب بحیثیت فرقہ اسکے حقدار ہیں کہ جنت میں جائیں بلکہ اسلام نے ایک معیار پیش کر دیا۔

یہودی کہتے ہیں ہم جنت میں جائینگے۔ نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم جنت میں جائینگے۔ اسلام نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ تم ثبوت پیش کرو اسکے بعد ارشاد ہوتا ہے بلیٰ من اسلم وجهہ للہ وھو محسن فلہ اجرہ عند ربہ ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔

ہم تمھارے مقابلہ میں یہ نہیں کہنا چاہتے کہ تم جہنم میں جاؤ گے

اور ہم جنت میں جائینگے۔ بلکہ ہم معیار پیش کرتے ہیں۔
"بے شک! جنت کا مستحق وہ ہے جو خدا کے پیغمبر کے سامنے سر تسلیم خم کردے اور اچھے اچھے کام کرے۔ اُسکے لئے اُسکا اجر ہے خدا کی بارگاہ میں اور کوئی خوف اور حزن اُسکے لئے نہیں ہے روز قیامت" اگر تمھارے اوپر یہ معیار منطبق ہوتا ہے تو تم ہی جنت کے مستحق سہی۔ اگر ہمارے اوپر ہے تو ہم جنت کے مستحق۔ اس طرح انداز بیان میں نرمی کا لحاظ رکھا گیا۔ مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب من یعمل سوء یجزبہ ولا یجد لہ من دون اللہ ولیاً و لا نصیراً۔

بہت سخت لب و لہجہ ہے قرآن مجید کا یہاں پر۔ مسلمانوں سے خطاب کرکے کہا گیا ہے۔ "اے مسلمانو! اپنے اسلام پر بھول نہ جانا جنت کی بنیاد نہ تمھاری آرزوؤں پر ہے نہ اہل کتاب کی آرزو پر نہ تمھارے خیالات کے سبز باغ جنت کے حاصل کرنے کے ذمہ دار ہیں اور نہ اہل کتاب کے۔" جو برا کام کرے گا اُس کو اُسکا بدلا دیا جائیگا۔ ہمت شکن ہے آیت! اُن لوگوں کے لئے جو فقط ظاہری اسلام پر پھولے نہیں مسلمان بحیثیت مسلمان صرف اسلئے کہ اسلام کے دائرہ میں ہیں۔
یہودیوں کی طرح یہ نہ کہیں کہ بس ہمارے لئے نجات ہوگی۔ قرآن مجید

مسلمانوں کو ایک صف میں کھڑا کر رہا ہے یہود و نصاریٰ کے ساتھ
اہل کتاب کی یہ تمنائیں تھیں کہ بس یہودیت ہی کافی ہے۔ یا نصرانیت
ہی کافی ہے۔ مگر مسلمانوں سے خطاب ہو رہا ہے " تم صرف اسلام کا
صرف کلمہ کے زبان پر جاری کرنے کو کافی نہ سمجھ لو۔ کچھ نہیں ہوتا تمہاری
آرزوؤں سے "۔ جو برا کام کرے اُس کو بدلا دیا جائے گا۔ اور خدا کے
سوا کوئی مددگار اُسکو نہیں ملے گا۔ نہ انہیں۔ اور نہ تمہیں "

اسکے بعد مسلمانوں کو رواداری کی تعلیم دینے کیلئے ارشاد کیا کہ
تم اپنی خبر لو۔ کسی کو نہ کہو کہ تمہیں نجات نہیں ہے۔

یا ایہا الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من
ضل اذا اھتدیتم الی اللہ مرجعکم جمیعا فینبئکم بما کنتم
تعملون۔

" اے اسلام لانے والو۔ تمہیں اپنے نفسوں کی خبر رکھنا چاہیئے
تم اپنے نفسوں سے ہوشیار رہو۔ اگر دوسرا گمراہ ہے تو تم ہدایت کے
راستے پر رہو۔ خدا کی طرف تم سب کی بازگشت ہے "۔ وہ تمہیں خبر
دیگا اُن تمام اعمال کی جو تم بجالاتے رہے ہو " عمل کی باز پرس وہاں
ہوگی۔ تم اپنی داخلی اصلاح کرو۔ دوسروں سے لڑنے جھگڑنے سے کیا
مطلب، دوسروں کے کام اُنکے ساتھ ہیں۔ تم اپنی طاعت کے جادہ پر

قائم رہو۔ اسکے بعد رسول سے مخاطب ہوکر ارشاد ہوتا ہے وان کذبوك
فقل لی عملی ولکم عملکم انتم بریئون مما اعمل وانا بریٔ مما تعملون
"اگر یہ تمھاری تکذیب کرتے ہیں (معلوم تو ہوتا ہے کہ جواب اس کا بہت
سخت ہوگا۔ مگر نہیں۔ ایسا جواب نہیں تعلیم ہوتا) تو حرج کیا ہے۔ تم ان سے
کہو کہ ہم اپنے کام کے ذمہ دار ہیں اور تم اپنے کام کے ذمہ دار ہو۔ تم بری ہو
اور بیزار ہو اُس سے جو ہم کام کرتے ہیں ہم بے تعلق ہیں تمھارے کاموں سے"
اسکے بعد پھر روئے خطاب متوجہ ہوتا ہے دوسروں کی طرف۔
قل یا ایھا النّاس قد جاءکم الحق من ربکم فمن اھتدی
فانما یھتدی لنفسہ ومن ضلّ فانما یضلّ علیھا وما انا علیکم
بوکیل۔ یہ بھی تمام عالم انسانیت سے خطاب ہے۔" اے گروہ مردم!
خدا کی طرف سے حق تمھارے پاس آیا ہے تو جو شخص صحیح راستہ اختیار
کریگا وہ اپنے خود نجات کا سامان کریگا اور جو راستہ سے منحرف ہوگا
وہ اپنا نقصان کریگا۔ میں تمھارے افعال کا ذمہ دار بناکر نہیں بھیجا گیا
ہوں۔ میں تمھارے طرز عمل کا نگراں نہیں ہوں۔
اسکے بعد مسلمانوں کو تعلیم دیجا رہی ہے۔ قل للذین لا یؤمنون
اعملوا علی مکانتکم انا عاملون وانتظروا انا منتظرون
جو ایمان نہیں لاتے تسلیم نہیں کرتے اُن سے کہو کہ تم اپنی جگہ پر بطور خود

عمل کئے جاؤ۔ ہم بھی کچھ نہ کچھ عمل کرتے ہیں۔ انتظار کرو کہ کس کا عمل نتیجہ میں کامیاب ہوتا ہے" (بالکل مساویانہ گفتگو) جو الفاظ ان کے لئے استعمال کئے گئے وہی اپنے لئے استعمال کئے تاکہ کسی کو ناگوار نہ ہو۔

انما امرت ان اعبد رب ھٰذہ البلدۃ الذی حرمھا ولہ کل شیئ وامرت ان اکون من المسلمین وان اتلو القراٰن فمن اھتدیٰ فانما یھتدی لنفسہ ومن ضل فقل انما انا من المنذرین۔

میں تو بس مامور ہوں کہ عبادت کروں اس گھر (خانہ کعبہ) کے مالک کی جس نے اس کو محترم قرار دیا ہے اور وہی ہر شے کا مالک ہے، اور میں مامور ہوا ہوں کہ اسلام اختیار کروں اور قرآن کی تلاوت کروں۔ تو جو شخص ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنا ہی نفع کریگا اور جو اس راستے کو چھوڑے گا تو (کچھ نہیں) اس سے کہدو کہ میرا کام تو فقط ڈرا دینا ہے۔

قل یا ایھا الکافرون لا اعبد ما تعبدون ولا انتم عابدون ما اعبد ولا انا عابد ما عبدتم ولا انتم عابدون ما اعبد لکم دینکم ولی دین۔

تمھارے لئے تمھارا دین ہے اور ہمارے لئے ہمارا دین ہے۔ تم اپنے راستے پر قائم رہو۔ ہم اپنے راستے پر قائم رہیں۔ اسکا فیصلہ وہاں ہوجائیگا اس طرح تمام دنیا کو مخاطب کرکے یہ تعلیم دی کہ درحقیقت ایک مسلمان

دوسرے شخص کو صرف تبلیغ کرے۔ صرف حق کی آواز پہونچا دیا کرے۔
جو ہر انسان کا فرض انسانیت ہو۔ فرض ہے کہ جس نقطہ نظر کو وہ سچا سمجھتا
ہو۔ دوسروں کو بھی اسی راستہ پر چلنے کی دعوت دے۔ اسلئے کہ دنیا کی
ہلاکت سے زیادہ آخرت کی ہلاکت اہمیت رکھتی ہے۔ جس طرح ایک
کنواں کھدا ہوا ہو۔ آپکے ساتھ چراغ ہو۔ آپ بچکر نکل گئے۔ دوسرا
چراغ لئے بغیر اندھیرے میں جانا چاہتا ہے۔ تو یہاں آپ کی خاموشی جرم
کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ بتلا دیجئے کہ راستہ میں
کنواں ہے۔ اور حتی الامکان اسکو باور کرانے کی کوشش کیجئے یعنی
اگر آپکے کہنے کو نہیں مانتا قسم کھانے کی ضرورت ہے قسم کھا کر بتائیے
جتنا زور دیکر کہنے سے امید ہو کہ مان لے گا۔ اتنا زور دے کر کہئے۔
اگر ضرورت ہو تو چراغ ساتھ لیکر چلے جائیے۔

اس نظریہ کے تحت میں تبلیغ لازم ہے۔ اسلئے کہ یہ تو دنیا کا
کنواں ہے جس میں انسان گرتا ہی لیکن وہاں ہلاکت ابدی میں مبتلا ہوتا ہے۔
اسلئے فرض ہے کہ جس بات کو حقیقتاً وہ صحیح سمجھتا ہو اس کو وہ دوسرے تک
بھی پہونچائے لیکن بس وہیں تک کہ تبلیغ کے حد میں رہے۔ جہاں تک
زور دینا چاہیئے اتنا ہی زور دے۔ جتنا ادلہ۔ اور براہین کے ساتھ آپ
اپنے نقطۂ نظر کو واضح کر سکتے ہیں اتنا واضح کیجئے۔

یہ واجب ہے۔ مگر آپ لڑئیے جھگڑئیے۔ دنیا میں فتنہ و فساد بپا کیجئے یہ تعلیم نہیں دی گئی ہے۔

اگر یہ چیزیں پیش نظر ہو جائیں تو جھگڑوں کا سدباب ہو جائے جھگڑا تو یونہی ہوتا ہے۔ کہ دوسروں کے عمل کا بھی اپنے کو ٹھیکیدار سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تصادم ہوتا ہے۔ اگر کوئی آپکے نزدیک برا کام کرتا ہے تو کہہ دیجئے کہ یہ برا کام ہے۔ مگر آپ لڑائی جھگڑے کا کیا حق رکھتے ہیں۔ یہ تصادم اسلامی تعلیم سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ لیکن ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے نام سے جس کسی کے مقابلہ میں ہم کوئی فساد کھڑا کر دیں تو وہ اسلام کی ایک خدمت ہوگی۔ اسلام کا بھی یہ حکم نہیں ہے۔

قرآن مجید نے اُن لوگوں کی جو امن پسند ہوں خواہ وہ غیر مسلمین ہوں۔ تعریف کی ہے۔ ہم تو اتنے تنگ نظر ہو گئے ہیں کہ اگر کسی سے نقطۂ خیال میں فرق ہے تو اُس کی اچھائی بھی زبان پر نہ لائینگے۔ مگر اسلام نے غیر مسلمین کی تعریف کی ہے۔ جو امن پسند ہوں۔ جن کا طرز عمل جارحانہ نہ ہو۔ اہل کتاب سب ہی تھے یہودی بھی اور نصاریٰ بھی لیکن تاریخی حیثیت سے اور حقیقت کے اعتبار سے جس قسم کا طرز عمل اسلام کے خلاف یہودیوں نے اختیار کیا۔ نصاریٰ نے نہیں اختیار کیا۔ قوائطہ

اور نضیر کی لڑائیاں یہودیوں ہی سے تھیں۔ جنگ خیبر بھی یہودیوں کے مقابلہ میں تھی۔ یہودیوں نے فوج کشی کی صف آرائی کی لیکن نصاریٰ وہ تھے جنھوں نے پہلے بہ دلائل دبراہین اسلام کا مقابلہ کرنا چاہا۔ محاجہ و استدلال کیا پھر پرامن مقابلہ یعنی مباہلہ کی صورت اختیار کی۔ اور جب اسمیں ناکامی رونما ہوتے ہوئی دکھلائی دی تو تعصب دامن گیر ضرور ہوا۔ کیونکہ اب اسلام لے آنا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ آگئی وہ محبت جو اپنے پرانے عقیدہ کے ساتھ تھی۔ اور یہ کہکر کہ ایک نئے نبیؐ کے سامنے ایمان کو قبول نہ کرو اس نے ایمان لانے سے باز رکھا۔ مگر جزبہ دیگر مصالحت پر تیار ہوگئے ایمان نہیں لائے۔ لیکن اتنا امن پسندانہ طرز عمل اختیار کیا کہ قرآن مجید میں اس بات کی تعریف موجود ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔ لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین امنوا الیھود والذین اشرکوا ولتجدن اقربھم مودۃ للذین امنوا الذین قالوا انا نصاریٰ ذالک بان منھم قسیسین ورھبانا وانھم لا یستکبرون۔

سخت سے سخت دشمنی تم مسلمانوں کے ساتھ دیکھو گے یہودیوں کی اور ان لوگوں کی جو شرک اختیار کرتے ہیں (یعنی مشرکین قریش) اور دیکھو گے سب سے زیادہ قریب محبت کے اعتبار سے ان لوگوں کو جو کہتے

ہیں کہ ہم عیسائی ہیں۔

بات یہ ہے کہ اُن میں پادری لوگ ہیں اور اُن میں پہاڑوں پر جاکر تمام دنیا سے بے تعلق ہو جانے والے عابد موجود ہیں۔ یہ دیکھئے اسلام کی سچائی اور انصاف پسندی۔ دنیا کہتی ہے اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ یعنی جس نے اسلام کے مقابلہ میں سرتابی کی۔ بس تلوار کھینچ لی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ جن لوگوں نے صلح پسندانہ طرز عمل اختیار کیا اُن کو اسلام الگ رکھتا ہے۔ اور جن لوگوں نے جارحانہ طرز عمل اختیار کیا اُن کو الگ رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہیں تھا تو کیوں نہ اسلام نے نجران میں تلوار کھینچی۔ کیوں نہ یمن میں عیسائیوں کو برباد کر دیا۔ بے شک جن لوگوں نے بزور شمشیر مادی طاقتوں سے چاہا کہ اسلام کو فنا کر دیں۔ اُن کا ردِ عمل اسی طریقہ سے کیا گیا۔ جو انکے طرز عمل کا نتیجہ تھا۔ اسلئے کہ ہر چیز کا جواب ہوتا ہے۔

اسلام نے اُن لوگوں کی مدح کی جو غیر مسلمین میں سے امن پسند تھے۔ جو امن کا طریقہ اختیار کرتے تھے۔

مگر ہم نے اسلام کے تعلیمات کو بھلا دیا۔ اسلئے روزانہ مشکلات ہیں۔ روزانہ مصائب ہیں۔ یاد رکھئے کہ اگر اسلام کے طرز عمل کو ہم اپنا نقطۂ نظر قرار دیں تو ہم خود بھی امن و امان سے رہیں۔ اور دنیا بھی

ہمارے ہاتھ سے امن امان میں رہے ۔

مگر ہم نے اس تعلیم کو فراموش کر دیا ۔ ہم غیر مسلم کے ساتھ تو کیا ۔ اپنوں کے مقابلہ میں رواداری کے لئے تیار نہیں ہیں ۔ ہم نے یہ بھلا دیا کہ اسلام نے مشرکین قریش کے ساتھ بھی امن پسندی کو نہیں چھوڑا وان جنحو اللسلم فاجنح لها وتوکل علی اللہ ۔ اگر یہ لوگ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ ۔ اور خدا پر بھروسا کرو" ہمارے سامنے قرآن مجید میں موجود ہے الصلح خیر ۔ صلح بہترین چیز ہے ہمارے سامنے یہ ہے کہ مشرکین قریش کے ساتھ جو برابر اسلام سے لڑتے رہے ۔ قرآن مجید نے یہ تعلیم دی ۔ ان قاتلوکم فاقتلوهم اگر یہ تم سے جنگ کریں تو تم بھی جنگ کرو ۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ ابتدا اُدھر سے قرار پائے گی ۔

اسکے بعد ارشاد ہوتا ہے ۔ وان یقاتلوکم فی المسجد الحرام فاقتلوهم اگر یہ تم سے وہاں (مسجد حرام میں) جنگ کریں تو تم بھی جنگ کرو حفاظت خود اختیاری کے طور پر ۔ جو انسان کا فطری اور لازمی فریضہ ہے ۔

مسلمانوں کے باہمی تعلقات

ہمارے سامنے یہ تعلیمات پیش کئے گئے کہ تم خدا کی رسّی کو مضبوط تھامو اور متفرق نہ ہو۔ کہا گیا کہ درحقیقت تم بھائی بھائی ہو آپس میں جھگڑا نہ کرو آپس میں لڑو نہیں۔ اے مسلمانو! نہیں تو یاد رکھو کہ تمہارے قوائے عمل کمزور ہو جائینگے اور تمہاری ہوا بگڑ جائے گی۔ لاتنازعو فتفشلوا وتذھب ریحکم وہی ہوا جو ہمارے آپس کے افتراق کا نتیجہ تھا کہ ہمارے پاس جو کچھ بھی حقانیت کے برکات تھے۔ حقانیت کی طاقت تھی۔ وہ رخصت ہوگئی۔ لیکن ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ ہم بیدار نہیں ہوتے۔ ہمارے یہاں روز روز نئے نئے فسادات ہوتے رہے۔ کون زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ جس میں کوئی نہ کوئی فساد نہیں ہوتا جتنا دائرہ محدود ہے اتنا ہی زیادہ جنگ وجدال ہے۔ ہم تمام مسلمانوں کو اپنا بھائی نہیں سمجھتے۔ اگر سمجھتے ہوتے تو ویسا ہی برتاؤ بھی اختیار کرتے۔ دشمنی اور عداوت اور چیز ہے اور اختلاف خیال اور چیز۔ نقطۂ خیال کا افتراق تو انسانی ذہنیت کا خاصہ ہے۔

بہرحال ہر شخص کو اپنے ذاتی نقطۂ خیال کا اختیار ہے جس کو وہ صحیح سمجھے اسکو مانے۔ مگر اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر کسی سے

نقطۂ نظر جدا ہو جائے تو ہم اُسکے دشمن بھی ہو جائیں۔ اگر ایسا طرز عمل ہو تو نظام دنیا میں خلل پڑ جائے۔ ہر جماعت میں اختلاف ہوا کرتے ہیں۔ وہ لوگ کہ جو مستقل فرقوں میں محسوب ہیں۔ اُن میں بھی آپس میں ایسے ذاتی اختلافات ہیں مسائل میں کہ ہر ایک اُن میں سے ایک نقطہ پر جمع نہیں ہوتا۔ مگر اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو تلوار سے فنا کر دے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ یہ سمجھانا بھی فتنہ و فساد کی بنیاد قرار دیا جائے یہ تو کسی جرم کے تحت میں نہیں آتا۔ نہ اسے دل آزاری سمجھنا چاہیئے۔ نہ ایذا سمجھنا چاہیئے۔ ایک بات ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ آپکے نزدیک غلط ہے۔ لیکن اسکی وجہ سے کیوں فتنہ و فساد قائم ہو؟ ہم اپنے خلاف بات سننے پر تیار کیوں نہ ہوں؟ ہم اتنے تنگ نظر ہیں کہ بس اُسی کو سن سکیں گے جو بات ہمارے خلاف نہ ہو لیکن چاہے کتنے ہی ملائم لفظوں میں کیوں نہ ہو اُسے ہم سننے پر بھی تیار نہیں جو ہمارے نقطۂ نظر سے ذرا مخالف ہو۔

پر آخر ہم اپنے گوش اعتبار پر پردے کیوں ڈال لیں۔ ہم اپنی چشم حقیقت بیں کو حجاب میں کیوں چھپائیں۔ درحقیقت خدا نے آنکھیں دی ہیں دیکھنے کے لئے۔ کان دئے ہیں سننے کے لئے۔ اگر کان دئے ہیں سننے کے لئے تو اُن سے ہمکو اپنے خلاف باتیں بھی

سننا چاہئیں۔ تاکہ ہماری قوت تمیز بھی کام کر سکے۔ تمیز تو جدا گانہ چیزوں میں ہی ہوا کرتی ہے۔ اگر جداگانہ چیزیں سامنے نہ ہوں۔ تو قوت تمیز بیکار ہوگی۔ اسلئے ہم میں اتنی وسعت نظر پیدا ہونا چاہیئے کہ کشادہ دلی سے اپنے خلاف باتیں بھی سن سکیں۔ رواداری سے اپنے خلاف باتیں بھی سن سکیں جس طرح اپنی بات سن سکتے ہیں۔ اسی طرح اپنے غیر کی بات بھی سن سکیں۔ اسکے بعد یہ اختیار ہے ہم کو کہ ہم مانیں یا نہ مانیں سنکر ہاتھ پاؤں میں زنجیریں تو پڑ نہیں جایا کرتیں۔ اگر صحیح معلوم ہو تسلیم کر لیں۔ غلط معلوم ہو چھوڑ دیں۔ یہ ہی تعلیم ہے جو اسلام نے دی۔ اس نے مشرکین کی بھی آوازوں کو سنا۔ یہودیوں کی بھی آوازوں کو سنا۔ نصاریٰ کی بھی آوازوں کو سنا۔ جواب کا موقع ہوا جواب دیا۔

لیکن یہ کہ سننے ہی کو تیار نہ ہوں۔ یہ اسلام نے مسلمانوں کو تعلیم نہیں دی۔ اُس نے تو مذمت اُن لوگوں کی کی ہے "یہ لوگ تو جب تم بات کہنا چاہتے ہو تو کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں تاکہ کچھ نہ سُنیں" یہ تو کافروں کا طرز عمل تھا۔ ہمکو تو سننا چاہیئے۔ چاہے جیسی بات ہو۔ اسکے بعد ہمیں یہ حق ہے کہ کہدیں غلط ہے صحیح نہیں ہے اسکے غلط کہنے پر کہنے والے کو بھی بُرا نہ ماننا چاہیئے۔ اگر یہ بات پیدا ہوجائے تو پھر دنیا میں فتنہ و فساد نہ ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ دنیا

میں مختلف نظریوں کا وجود ہی نہ ہو۔ یہ محال ہے۔

"یہ اختلاف نہیں مٹ سکتا۔ اگر خدا انھیں اپنی جبری طاقت سے چاہے تو سب کو ایک کر دیگا۔ لیکن خدا اپنی جبری طاقت کو تصرف ہی کرنا نہیں چاہتا۔ اُس نے تو اختیار دیدیا جس کا جی چاہے ایمان لائے جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔" اگر ایسا نہ ہوتا تو بدلا کاہے کا ہوتا اسی معصیت کے اختیار پر تو بدلے کی نبیاد قائم ہے جزا اور سزا کی نبیاد قائم ہے۔ اب اگر نظام عالم درست ہو سکتا ہے تو اسی طرح سے درست ہو سکتا ہے کہ اختلاف نظر کے ساتھ ساتھ ہر ایک دوسرے کے اختلاف خیال کو برداشت کر سکے۔ تب ہی نظام دنیا درست ہو سکتا ہے خصوصاً ہندوستان ایسا ملک ہے جہاں کان ہے مذہبوں کی۔ جتنے پرانے تھے وہ تو تھے ہی۔ اور خدا پنجاب کی زمین کو سلامت رکھے کہ مذہب کی پیداوار بھی ہوتی ہے۔ یوں سب ایک ہو سکیں یہ ناممکن ہے۔

اگر ہم دنیا کی ہستی قائم رکھنا چاہتے ہیں تو یہ طرز عمل ہونا چاہیے کہ ہر ایک کو اُسکا نقطۂ نظر مبارک۔ تم کچھ کہو۔ ہم تسلیم نہیں کرتے مگر لڑنے پر تیار نہ ہوں۔ ہم جو کہیں اُنہیں دوسرے کو اعتراض نہ ہو۔ یوں تو دنیا قائم رہ سکتی ہے۔

عناصر دنیا میں اضداد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کرۂ نار ہوا میں موجود ہے۔ آگ پانی کو ہوا کر دینے پر تیار اور پانی آگ کو بجھانے پر آمادہ تو نظام عالم درہم و برہم ہو جاتا مگر ایسا نہیں ہے تو کیا ہوا؟ آگ نے اپنی خاصیت کو چھوڑ دیا؟ پانی نے اپنے اثر کو ترک کر دیا؟ ہر ایک میں اثر موجود ہے۔ اپنی اپنی حد میں۔ ایک دوسرے کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ نہیں تو یہ عالم ہی تباہ ہو جاتا۔ یہ نظام کائنات ہی قائم نہ رہتا۔

مگر ایک دوسرے کی حد میں قدم نہیں رکھتا۔ اس نظام کو اس نے اپنے ہاتھ میں رکھکر ہم کو یہ سبق دیا کہ تم اپنے حدود عمل میں رہ کر یوں انتظام کر دو یوں مختلف عناصر کو اپنے ہاتھ کے اندر رکھکر تنظیم کرو۔ میں کہتا ہوں تنظیم اس طرح ممکن ہے خدا نے اس کی تعلیم دی کہ ہر ایک اپنے نقطۂ نظر میں رہے۔ تو پھر تم ایک لڑی میں منسلک ہو سکتے ہو۔

جب چاہا اس طرح سے الگ الگ رکھکر دکھا دیا۔ جب چاہا ایک جسم میں عناصر کو جمع کر کے دکھا دیا کہ دیکھو! اس طرح سے متحارب قوتیں ایک جگہ جمع کر کے انتظام کرتے ہیں۔

لیکن ہم میں اگر اتنی وسعت نظر نہیں ہے کہ ہم دوسرے کی بات کو سن سکیں تو تصادم ہوگا اور تصادم کے نتیجہ میں فنا ہو جائنگے۔

اسلئے کہ کمزور اور طاقت ور کا مقابلہ جب ہو۔ تو پہلے تو طاقتور کمزور کو فنا کر دے گا۔ مگر طاقتور پہ بھی اثر ضرور پہنچے گا نقصان دونوں طاقتوں کو ہوگا۔

ہم کو اسلام کی تعلیم کو سرنامۂ عمل قرار دینا چاہیئے۔ اگر ایسا کریں تو ہم امن و خاموشی کی اس جنت میں پہنچ جائیں جہاں آرام و راحت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن ہم اس پر عمل نہیں کرتے اس لئے یہ تمام تکلیفیں ہم کو برداشت کرنا پڑتی ہیں۔

امامیہ مشن کی ممبری قبول فرماکر

ناصرین اہلبیت علیہم السلام کی فہرست میں اپنا نام نامی درج کرائیے

چندہ لائف ممبری	کم از کم پچاس روپیہ یکمشت
چندہ ممبران خصوصی	〃 پانچ روپیہ سالانہ
چندہ ممبران عمومی	〃 ایک روپیہ سالانہ

نوٹ

لائف ممبران کی خدمت میں سابقہ اور آئندہ کے تمام رسائل بلا طلب و بلا قیمت ارسال ہوتے رہیں۔

ممبران خصوصی کی خدمت میں ممبر بننے کے بعد تمام رسائل بلا طلب و بلا قیمت ارسال ہوتے رہتے ہیں اور اگر سابق کے رسائل خریدنا چاہیں تو صرف نصف قیمت چارج کی جاتی ہے۔

ممبران عمومی کو ممبر بننے کے بعد شایع ہونے والے رسائل (بشرطیکہ وہ طلب فرمائیں) نصف قیمت پر دیے جاتے ہیں اور سابق کے رسائل اگر خریدنا چاہیں تو پوری قیمت چارج کی جاتی ہے۔

العبد الی اللہ

سید ابن حسین عفی عنہ
انزیری سکریٹری امامیہ مشن
لکھنؤ

امامیہ مشن کے تبلیغی رسالے

نمبر	نام کتاب	قیمت	قیمت	نمبر	نام کتاب	قیمت
۱	قاتلان حسینؑ کا مذہب	۴/	۱/-	۱۸	مجاہدۂ کربلا	۲
۲	تحریف قرآن کی حقیقت	۶/	۱/۱	۱۹	کربلا کا آتم بلیدان (ہندی)	۲
۳	مولود کعبہ	۱/	۱/-	۲۰	دی ہار شیڈم آف حسینؑ (انگریزی)	۳
۴	وجود حجت	۴/	۱/-	۲۱	اسوۂ حسینی	[illegible]
۵	اصول دین اور قرآن	۴/	۱/-	۲۲	جنگ صفین	[illegible]
۶	اتحاد الفریقین (حصہ اول)	۴/	۱/-	۲۳	تذکرۂ حفاظ شیعہ (حصہ اول)	۶
۷	حسینؑ اور اسلام اردو	۱/-	۱/-	۲۴	" " (حصہ دوم)	۵
۸	" ہندی	۱۰/	۱/-	۲۵	مقصود کعبہ	[illegible]
۹	" انگریزی	۲/	۱/-	۲۶	مذہب اہلبیت بے بہا (حصہ دوم)	[illegible]
۱۰	متعہ اور اسلام	۸/	۱/-	۲۷	مذہب اور سائنس	[illegible]
۱۱	امامت ائمہ اثنا عشر اور قرآن	۱۰/	۱/-	۲۸	معرکۂ کربلا	۳
۱۲	تجارت اسلام	۳/	۱/-	۲۹	کربلا کا مہایدھ (ہندی)	۳
۱۳	اتحاد الفریقین (حصہ اول)	۴/	۱/-	۳۰	دی ٹریجڈی آف کربلا (انگریزی ایڈیشن)	۲
۱۴	علیؑ اور کعبہ	۱/	۱/-	۳۱	اسلام کی حکیمانہ زندگی	[illegible]
۱۵	رجال بخاری (حصہ اول)	۸/	۱/-	۳۲	دورۂ استبداد	[illegible]
۱۶	مذہب اہلبیت بے بہا (حصہ اول)	۵/	۱/-	۳۳	حقیقت بدا	۱۲
۱۷	نوروز غدیر	۱/	۱/-	۳۴	خطیب آل محمدؐ	[illegible]

ملنے کا پتہ :- آنریری سکریٹری امامیہ مشن۔ لکھنؤ

پرنٹر سید محمد رضی - پبلشر سید ابن حسینؑ